تفسیر موضوعی

اثبات و معرفت خدا

خدا کے وجود کے دلائل اور اسکی پہچان
قرآن، حدیث اور جدید علوم کی روشنی میں

مصنّف
ڈاکٹر محمد حسن رضوی

انیسہ اکیڈمی کراچی

تفسیر موضوعی

اثبات و معرفت خدا

خدا کے وجود کے دلائل اور اسکی پہچان
قرآن، حدیث اور جدید علوم کی روشنی میں

مصنّف

ڈاکٹر محمد حسن رضوی

انیسہ اکیڈمی کراچی

نام کتاب .... اثبات و معرفت خدا

مصنّف .... ڈاکٹر محمد حسن رضوی

تعداد اشاعت .... ۱۰۰۰ ہزار

ناشر .... ملک علیم علی

اکیڈمی آف قرآنک اسٹڈیز

انیسہ اکیڈمی کراچی

03002354679



قوم کے نوجوانوں کے نام

نوٹ

انیسہ اکیڈمی نے مرحومین کے ایصال ثواب کے لئے مختلف کتب طبع کرنے کا پروگرام مرتب کیا ہے اس سلسلے میں ملت جعفریہ کے مخیّر حضرات سے تعاون کی درخواست ہے جو مومنین اپنے مرحومین کے ایصال ثواب کیلئے کسی بھی کتاب میں نام دینا چاہیں یا کسی کتاب کی طباعت کرانا چاہیں تو انیسہ اکیڈمی سے رابطہ کریں

شکریہ

Mobile: 03002354679

تعارف

تفسیر موضوعی کے سلسلے کی پہلی کتاب ''اثبات و معرفتِ خدا'' کے عنوان سے اسلئے لکھی تا کہ جوان نسل کے دل و دماغ میں یہ بات ثبت کی جائے کہ خدا کا وجود جدید ترین علوم کی روشنی میں کہیں زیادہ بہتر طور پر ثابت ہے اور یہ کہ جدید علوم سے خداوند عالم کی معرفت زیادہ موثر طور پر حاصل کی جاسکتی ہے۔

اس مقصد میں 'میں کہاں تک کامیاب ہوسکا ہوں، اس کا اندازہ خود قارئین کرام بہتر طور پر فرما سکتے ہیں۔ برادر محترم آقائے جنتی وَانیسہ اکیڈمی کا خاص طور پر مشکور ہوں کہ انہوں نے از خود تشریف لاکر اپنے تعاوُن کی پیشکش فرمائی۔ خدا ان کو اس کارِ خیر میں تعاون کرنے کا اجر دُنیا اور آخرت دونوں میں عطا فرمائے۔

آخر میں خداوند عالم سے دُعا ہے کہ وہ اس حقیر اور ادنیٰ سی کوشش کی صرف اور صرف اپنی شانِ کبریائی، رحمانیت اور رحیمیت، عظمت کرامت شرافت اور رحمت کی وَجہ سے قبول فرمائے۔

شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدارا

(یعنی بادشاہوں کے لئے یہ کوئی بڑی بات نہیں کہ وہ کسی فقیر کو بلا کسی وجہ کے نواز دیں)۔

(ڈاکٹر) محمدحسن رضوی

۱، اکتوبر، ۲۰۰۳

معروضات

ڈاکٹر علامہ سیّد محمد حسن رضوی کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ سادگی اور منکسر مزاجی نے ان کی شخصیت کو جلا بخشی ہے اور ان کا منفرد لب ولہجہ قدرت کی عطا ہے۔ یوں تو دینوی علوم کے حصول میں وہ کسی سے پیچھے نہیں ہیں مگر دینی علوم پر انکی گرفت ان کو ممتاز بناتی ہے۔ ان کی مجالس کا سامع خیر و برکت کے علاوہ کوئی نئی بات جو پہلے اسے معلوم نہیں تھی لیکر واپس جاتا ہے۔ حقیقت الامر یہ ہے کہ زبان و بیان پر یہ قدرت اور اثر پذیری بغیر طاقت ور مبلغ علم کے ممکن نہیں اور یہ تجربہ کار خطیب استنباط کی طاقت، عالمانہ تجزیوں کی اساس اور فصاحت و بلاغت سے اپنے سامعین کو یقیناً متاثر کرتے ہیں۔

استاد محترم سیّد محمد حسن رضوی کے یہاں فکری و فلسفیانہ صلاحیت کی ارزانی ہے انہیں علم الکلام ،فقہ واصول ،فقہ ،فلسفہ، منطق اور علوم طبیعی پر قابل رشک حد تک درک حاصل ہے۔ نیز اردو، فارسی ،عربی اور انگریزی زبانوں پر وہ مکمل دسترس رکھتے ہیں۔

انھوں نے نہ صرف ہر زبان میں خطابت کے جوہر دکھائے ہیں بلکہ عربی و فارسی ماخذوں سے ترجمے بھی کیئے ہیں۔ ابو جعفر محمد بن یعقوب الکلینی الرازی البغدادی کی مشہور کتاب ''الکافی'' جو امیر المومنینؑ اور آئمہ اہلبیتؑ کے مستند کلام پر مشتمل ہے اسی کا ترجمہ انگریزی زبان میں کیا جو موصوف کی زباں دانی کا منہ بولتا ثبوت ہے اور جس کا ہر حلقہ فکر میں اعتراف کیا جاتا ہے۔

زیر نظر کتاب کی اشاعت و طباعت کی ذمے داری انیسہ اکیڈمی و ملت جعفریہ کے مخیر حضرات نے قبول کی۔ کہ اس موضوع پر کتاب کی ضرورت شدت سے محسوس کی جاتی رہی ہے۔ انیسہ اکیڈمی اس کتاب کو شائع کر کے ایک علمی و دینی خدمت انجام دے گی۔ مولانا نے لاالہٰ کے گھپ اندھیروں بھٹکنے والے انسانوں کو الا اللہ کی روشنی دکھائی ہے۔ قرآن، احادیث اور جدید علوم کی روشنی میں خدا کے وجود پر دلائل پیش کرنا ایک ایسا کارنامہ ہے جس کو فی زمانہ انجام دینا آسان نہ تھا۔ مولا علیؑ نے فرمایا کہ۔۔'' خدا کی ذات کو ہمتوں کی بلند پروازیاں نہیں پا سکتیں اور فکروں کی گہرائیاں اس کی تہہ تک نہیں پہنچ سکتیں'' مولائے کائنات نے اثبات و معرفت کے

بارے میں بڑی وضاحت کے ساتھ فرمایا ہے:

"دین کی بُنیاد خدا کی معرفت ہے۔ اور اس کی معرفت کا کمال اس کی تصدیق ہے اور اس کی تصدیق کا کمال اسے واحد و یکتا ماننا ہے اور اس کے اقرار وحدانیت کا کمال اسے ہر چیز سے برتر سمجھنا ہے اور کمال اخلاص (اس کی ذات سے) صفات کی نفی ہے اس لئے کہ ہر صفت شاہد ہے کہ وہ اپنے موصوف کی غیر ہے اور ہر موصوف شاہد ہے کہ وہ اپنی صِفت کا غیر ہے۔ لٰہذا جس نے ذاتِ خداوندی کے علاوہ صفات مانے اس نے خدا کا ساتھی مان لیا اور جس نے اس کا ساتھی مان لیا اس نے دوئی پیدا کی اور جس نے دوئی پیدا کی اس نے اس (وحدہٗ لاشریک) کے جزو مان لیے اور جس نے اس کے اجزاء مان لیے وہ اسے نہ پہچان سکا۔"

یہ علم کلام کا اہم ترین مسئلہ ہے کہ واجب الوجود اجزاء سے بری ہے تفصیلات سے گریز کرتے ہوئے مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ تجزی مستلزم امکان ہے اور اللہ منزل امکان سے اَرفع واعلیٰ ہے یا یوں کہا جائے کہ خدا اجزاء سے قطعاً بری ہے۔ اندریں صورت اگر غور کیا جائے تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ موضوع کتاب بڑا دقیق اور نازک ہے مگر آج جبکہ الحاد و شرک کا دور دورہ ہے اور جدید ٹیکنالوجی اور مختلف النوع سائنسوں کے کمالات نے "حقیقت" کو دبیز پردوں کے پیچھے چھُپا دیا ہے، یہ موضوع نہایت اہمیت اختیار کر جاتا لیکن استاد محترم مولانا محمد حسن رضوی نے خدا کے وجود کو مادیت پسند ذہنوں کے لئے ایسی ٹھوس عقلی دلیلوں سے ثابت کیا ہے کہ وہ گمراہی کی مصیبت سے بچ سکتے ہیں اور خدا کے وجود اور اس کی وحدانیت کو تسلیم کر کے حیرانی اور سرگردانی سے نجات حاصل کر سکتے ہیں۔ استاد محترم کی اس کوشش کو بھٹکنے والوں کے لئے روشن نشانی قرار دیا جا سکتا ہے جس سے یقیناً رہنمائی ہوگی۔ انشاءاللہ۔

، آخر میں استاد محترم کی اس عنایت کا شکریہ ادا کروں گا کہ انہوں نے میری درخواست قبول کر کے اس اہم کتاب کی طباعت واشاعت کا انیسہ اکیڈمی کو موقع فراہم کیا جو یقیناً ہمارے لئے باعثِ سعادت ہے۔

ملک علیم علی

آہ یہ تو نے کیا کیا؟ مجھ کو بھی فاش کر دِیا
مَیں ہی تو ایک راز تھا، سینۂ کائنات میں

اقبالؒ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خدا کے وجود کے دلائل اور اس کی معرفت

(سورۂ بقرہ۔ آیت ۲۸۔ ۲۹)

"آخر تم کس طرح اللہ کا انکار کرتے ہو جبکہ تم بالکل بے جان تھے تو اس نے تمہیں زندہ کیا۔ پھر وہی تم کو مار ڈالے گا، پھر وہی تمہیں دوبارہ زندہ کرے گا۔ پھر اسی کی طرف تم کو پلٹ کر جانا ہے۔(۲۸)

وہی (خدا) تو ہے جس نے تمہارے فائدے کے لئے زمین کی ساری چیزیں پیدا کیں۔ پھر اس نے اوپر کی طرف توجہ کی تو سات آسمان درست کئے۔ غرض وہ ہر چیز کا خوب جاننے والا ہے۔"(۲۹)

تشریح

جو لوگ خدا کو نہیں مانتے اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ خود اپنی خلقت اور کائنات کی تخلیق کے رموز و اسرار پر غور و فکر ہی نہیں کرتے۔ وہ اتنا بھی غور کرنا نہیں چاہتے کہ وہ یہی سوچ لیں کہ وہ خود کس طرح پیدا ہو گئے؟ ہر شخص کا دل گواہی دے رہا ہے کہ اُس نے خود کو از خود پیدا نہیں کیا۔

اب یہ سمجھ لینا کہ ہم جیسی سوچتی، سمجھتی، محسوس ہوتی، جیتی جاگتی مخلوق کو ایک گونگی بہری، اندھی بے عقل طبیعت کے عوامل (فزیکل ایلیمنٹز) نے پیدا کردیا ہے، تو یہ عقل دشمنی کے سوا کچھ نہیں۔ بقول ڈاکٹر اقبال۔

تری نگاہ میں ثابت نہیں خدا کا وجود
مری نگاہ میں ثابت نہیں وجود ترا

اس آیت میں خدا نے انسان کی تعجب انگیز خلقت کا ذکر فرما کر اپنے وجود کا اثبات اس نکتے سے فرمایا کہ ہم خود اپنی تخلیق اور زندہ ہونے کے پراسرار مسئلے پر غور کریں۔ جبکہ ہم کچھ بھی نہ تھے تو آج کس طرح اپنے وجود، اعضا وجوارح، حواس وادراک، اور عقل وشعور کے مالک بن بیٹھے۔ آخر اتنی عظیم چیزیں ہمیں کس نے عطا کردیں؟ ہر باضمیر انسان گواہی دیتا ہے کہ اس نے خود کو پیدا نہیں کیا۔ جبکہ ہمارا وجود بے شمار چھپے ہوئے پیچیدہ ترین رازوں اور حقیقتوں پر منحصر ہے۔ جن قوانین کی صرف سمجھنے ہی کے لئے بے حد علم اور تجربہ درکار ہے۔ اس لئے ہمارے جیسے عظیم وجود کو یہ بے شعور فطرت جو خود زندگی اور عقل واحساس سے خالی ہے، کس طرح وجود عطا کرسکتی ہے؟

زندگی کے بعد موت کا مرحلہ آتا ہے۔ ہمارے کتنے دوست، عزیز ساتھی، بزرگ، خود موت کی آغوش میں چلے جاتے ہیں۔ آخر وہ کون ہے؟

جس نے ان سے دنیوی یعنی مادی وجود کو چھین لیا؟ اگر انھوں نے اپنی زندگی کو خود پیدا کیا تھا تو وہ زندگی ہمیشہ ان ہی کے پاس رہنی چاہئے تھی۔ (تفسیر نمونہ)

تیسرا پیغام ان آیات میں یہ دیا گیا ہے کہ تم خدا سے بغاوت کا رویہ کس طرح اختیار کرسکتے ہو جبکہ خدا تمہاری حرکات و سکنات سے باخبر ہے اور وہ تمام حقائق سے واقف ہے اس لئے کہ وہ تمام علوم کا سرچشمہ ہے۔ علم خدا ہی سے عطا ہوتا ہے اس کی ہدایت کے بغیر تم زندگی کا مفہوم سمجھ ہی نہیں سکتے۔ خدا سے منہ موڑ لینے میں خود تمہارا سراسر نقصان ہے۔ اس لئے کہ خدا ہی تمہارا خالق مالک' پالنے والا اور مارنے والا ہے۔

اس کے قبضہ قدرت میں تمہاری زندگی بھی ہے اور موت بھی۔ پھر وہی پوری کائنات کا مالک اور مدبر بھی ہے۔ اس لئے تمہارے لئے اس کی بندگی اور اطاعت کے سوا زندگی کا کوئی اور ٹھیک راستہ نہیں۔ اس آیت سے انسان اور کائنات کی حقیقت اور اس کا اصل مقام اور حیثیت معلوم ہوگئی۔ (تفہیم)

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ ان آیات میں خدا کے انکار کی جہالت پر بے حد تعجب کیا گیا ہے۔ (تفسیر کبیر امام راغب)

ان آیات میں پیغام بھی دے دیا گیا کہ کائنات کا خالق بھی خدا ہے اور اس کو قائم رکھنے والا بھی خدا ہے۔ موت اور زندگی دینے والا بھی

خدا ہے۔ اس لئے مشرکوں کا یہ عقیدہ بالکل غلط ہے کہ کائنات کے خالق برہما جی ہیں اور قائم رکھنے والے وشنو جی ہیں۔ اور موت زندگی دینے والے شیو جی ہیں۔ اس طرح اس آیات نے توحید خالص کی تعلیم دے کر ہر قسم کے شرک اور مخلوق پرستی کی جڑ کاٹ دی۔

دوسرا پیغام یہ دیا گیا کہ ساری مخلوقات انسان کے لئے پیدا کی گئی ہیں اور انسان کو خدا کی اطاعت کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ اس لئے فرمایا۔

"یہ وہی خدا ہے جس نے جو کچھ بھی زمین میں ہے تمہارے لئے پیدا کیا ہے۔"

مشرک انسان اس فطری، قدرتی اور منطقی ترتیب کو الٹ دیتا ہے۔

نہ تو زمین کے لئے ہے نہ آسمان کے لئے
جہاں ہے تیرے لئے، تو نہیں جہاں کے لئے

(اقبال)

جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ "دنیا تو تمہارے لئے پیدا کی گئی ہے اور تم آخرت کے لئے پیدا کئے گئے ہو۔" اس لئے دنیا ہی میں خدا کی اطاعت کرکے اپنی آخرت کو سنوارو۔ یہی انسان کا شرف ہے۔

ڈارون کا ترقی یافتہ بندر، انسان کے اس مقام کو کیا جانے۔ بقول اکبر الہ آبادی۔

کہا منصور نے خدا ہوں میں!

ڈارون بولا بوزنہ ہوں میں

سن کے کہنے لگے مرے اک دوست

فکر ہر کس بقدر ہمت اوست

ایک دہریئے نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے پوچھا کہ "خدا کے ہونے کی کیا دلیل ہے؟"

حضرت امامؑ نے فرمایا۔

"کائنات کا موجودہ ہونا اس بات کی علمی دلیل ہے کہ کوئی اس کا بنانے والا ضرور ہے۔ کیا جب تم کسی بڑی عمارت کو دیکھتے ہو تو تمہاری عقل یہ نہیں بتاتی کہ اس عمارت کا کوئی بنانے والا ہے جبکہ تم نے اس عمارت کے بنانے والے کو کبھی دیکھا بھی نہ ہو۔"

پھر حضرت امامؑ نے فرمایا "اس خالق کائنات کا نہ تو کوئی جسم ہے نہ صورت۔ نہ اس کو چھوا جاسکتا ہے اور نہ حواس خمسہ اس کی حقیقت کا ادراک کرسکتے ہیں۔ حتیٰ کہ عقل وہم تک اس کی ذات کی حقیقت کو نہیں سمجھ سکتے۔ وقت اس میں کوئی نقص نہیں پیدا کرسکتا۔ اس لئے کہ وہ ان سب اثرات سے الگ ہے کیونکہ وہ ان سب کا خالق ہے اور مالک ہے۔" (اصول کافی از کتاب التوحید)

آسمانوں کی تخلیق کے عجائبات

اب تک ستاروں کی تعداد بیس کروڑ سے زیادہ معلوم ہو چکی ہے۔ ان میں ایسے ایسے سورج بھی ہیں جو زمین سے لاکھ گنا بڑے ہیں اور ان کی روشنی اتنی ہے کہ آٹھ لاکھ مکمل چاند مل کر بھی اتنی روشنی نہیں دے سکتے۔ ہمارے سورج کی روشنی دوسرے سورج سے آٹھ گنا کم ہے جبکہ چاند اور سورجوں کی تعداد بے انتہا ہے۔ سب کے سب اپنے مداروں پر گھوم رہے ہیں مگر ان میں کوئی تصادم' ٹکراؤ یا بدنظمی پیدا نہیں ہوتی۔ خدا فرماتا ہے۔

"نہ تو کوئی سورج کسی چاند کی رفتار میں رکاوٹ پیدا کر سکتا ہے اور نہ (ان کے) رات دن کے سلسلوں میں کہیں کوئی بدنظمی پائی جاتی ہے۔ یہ تمام سورج اور چاند نہایت باقاعدگی کے ساتھ فضا میں تیر رہے ہیں۔" (سورہ یٰسین آیت ۴۰)

نیز فرمایا۔

"اللہ نے آسمانوں کو یوں تھام رکھا ہے کہ وہ زمین پر بلاحکم نہیں گر سکتا۔" (سورہ حج۔ آیت ۶۵)

ہمارے ہوائی جہاز باوجود باقاعدہ نظام الاوقات کے ہر روز ٹکراتے رہتے ہیں جبکہ کروڑوں عظیم الشان سورج' چاند اور بڑی بڑی زمینیں بجلی

کی رفتار سے بھی زیادہ تیز تیز رہی ہیں۔ نہ کوئی سگنل دینے والا ہے مگر کروڑوں سال سے چل رہی ہیں یہ اس لئے کہ ضرور کوئی آنکھ ہے جو ان کی نگرانی کر رہی ہے۔ جو کبھی غلطی بھی نہیں کرتی۔ خدا نے فرمایا۔

"کائنات کی ہر چیز اپنی نماز (یعنی قانون) نظم و ضبط' فرائض کو خوب جانتی ہے۔ (سورہ نور آیت ۴۱)

ایسے ستارے بھی ہیں جو پچاس ہزار سال میں اپنے مرکز کے گرد چکر پورا کرتے ہیں۔ اسی لئے شاید خدا نے فرمایا۔

"اللہ کا ایک دن ہمارے ہزار سال کے برابر ہے" (سورۂ حج)

"ایسے دن ہیں جو تمہارے پچاس ہزار سال کے برابر ہیں۔" (سورہ معارج)

آج سے ارب کھرب سال پہلے کسی کہکشاں سے چند شعلے ٹوٹے جو سیاروں اور ستاروں کی شکل میں فضا میں اڑے۔ مگر مختلف سورجوں نے انہیں کشش کی وجہ سے اپنی طرف کھینچ لیا اور اپنے گرد چکر لگانے پر مجبور کردیا۔ اگر یہ سورج ان سیاروں کو نہ روکتے تو وہ سیارے بھاگتے ہی رہتے اور نہ جانے کہاں سے کہاں نکل جاتے۔ اور راستے میں نہ معلوم کتنی دنیاؤں سے ٹکرا کر کس قدر تباہی مچاتے۔

تمہارا خدا ایک ہی خدا ہے۔ اس سب کو فیض اور فائدے پہنچانے والے اور بے حد مسلسل رحم کرنے والے کے سوا کوئی اور خدا نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ عقل وشعور سے کام لیتے ہیں۔ ان کے لئے آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں رات دن کے مسلسل ایک دوسرے کے بعد آنے جانے میں، ان کشتیوں میں جو انسانوں کو فائدہ پہنچانے والی چیزوں کو لئے ہوئے سمندر میں چلتی پھرتی ہیں، اس پانی میں جسے اللہ نے آسمان سے برسایا۔ اور پھر اس کے ذریعہ سے زمین کو بے جان ہونے کے بعد زندگی بخشی۔ پھر زمین ہر قسم کے چلنے پھرنے والوں کو پھیلا دیا۔ اس کے علاوہ ہواؤں کے ہیر پھیر، گھومنے پھرنے میں، اور ان بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے درمیان تابع فرمان بنا کر رکھ رکھے گئے ہیں۔ (خدا کے وجود احسانات اور عظمت کی) بے شمار دلیلیں اور نشانیاں موجود ہیں۔(۱۶۴)

مگر اس کے باوجود کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ جو اللہ کے سوا دوسروں کو خدا کا ہمسر ومدمقابل اور برابر قرار دیتے ہیں اور ان

(جھوٹے خداؤں) سے ایسی ٹوٹ کر محبت کرتے ہیں جیسی محبت اللہ کے ساتھ کرنی چاہیے۔ مگر جو لوگ خدا کو دل سے مانتے ہیں وہ سب زیادہ اللہ ہی سے محبّت کرتے ہیں۔ کاش یہ ظالم جو کچھ خدا کے عذاب کو دیکھ لینے کے بعد سمجھنے والے ہیں، اسے (آج ہی) سمجھ لیتے ہیں کہ ساری کی ساری طاقتیں صرف (اور صرف) اللہ ہی کے لئے ہیں اور یہ کہ خدا سزا دینے میں بہت ہی سخت ہے۔(۱۶۵)

تشریح : جدید علوم کی روشنی میں

آسمانوں کی تخلیق

اب تک ہمیں تقریباً دس کروڑ ستارے نظر آچکے ہیں۔ اس کے باوجود ہماری زمین نہ تو سورج سے اتنی زیادہ قریب ہے کہ جھلس جائے اور نہ اتنی دور ہے کہ ٹھٹھر کر رہ جائے۔ جبکہ آفتاب کا طوفان نور چاروں طرف پھیل رہا ہے اور ہماری زمین سورج کی روشنی کا صرف 2,000,000,000 کروڑ حصہ حاصل کرتی ہے۔ اندازہ فرمائیں کہ سوج کتنی روشنی اور توانائی ہمیں ہر روز مفت مہیا کر رہا ہے جبکہ سورج ہم سے اتنا دور ہے کہ اگر ایک گاڑی چالیس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلے تو ۲۵۲ سال کے بعد سورج پر پہنچے گی۔ سورج ہماری زمین سے ۹ لاکھ میل

سے زیادہ دور ہے اور زمین سورج کے گرد ۶۴۸۰۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے گھوم رہی ہے۔ اس لئے زمین چوبیس گھنٹے میں ۱۶ لاکھ میل سفر کرتی ہے۔ اس قدر تیز رفتاری کے باوجود زمین نہ تو لرزتی کانپتی ہے اور نہ کسی سیارے یا چاند سے ٹکراتی ہے اور نہ ہمارا سر چکراتا ہے اور نہ ہمارے کسی کام میں کوئی خلل پڑتا ہے۔

زمین کی تخلیق کے عجائبات

پھر اللہ کی رحمت دیکھئے کہ ہماری زمین نہ تو اتنی وزنی ہے کہ پاؤں تک نہ اٹھایا جاسکے اور نہ اتنی ہلکی ہے کہ معمولی سی آندھی سے مکانات اڑجائیں اور ہمارے بچے تنکوں کی طرح ہوا میں اڑتے پھریں۔ یہ اس لئے ہے کہ خدا نے فرمایا۔

"ہم نے ہر چیز کو ایک اندازے سے پیدا کیا ہے" (سورۂ قمر آیت ۴۹)

اگر ہماری زمین موجودہ رفتار سے بہت تیز حرکت کرنے لگے تو کسی چیز میں کوئی وزن باقی نہ رہے۔ فضا میں ہوا کی جگہ سیماب بھر جائے جس کی وجہ سے ہم پسپا ہو کر مرجائیں۔

غرض مطلب یہ ہے کہ اگر انسان کائنات کے اس کارخانے کو جو رات و دن اس کے سامنے چل رہا ہے، جانوروں کی طرح نہ دیکھے، بلکہ اس پر اپنی عقل بھی استعمال کرے اور ساتھ ساتھ ضد، تعصب اور ذاتی

مفادات سے آزاد ہو کر سوچے اور غور کرے، تو لازمی طور پر وہ اس نتیجے پر پہنچے گا کہ یہ عظیم الشان نظام کائنات کسی قادر مطلق اور حکیم مطلق کے زیر نگرانی چل رہا ہے۔ (تفہیم)

بقول ڈاکٹر اقبال۔

دل بینا بھی کر خدا سے طلب
آنکھ کا نور دل کا نور نہیں

اس لئے کہ زمین و آسمان کا یہ سارا نظام جو دنیا کے ہر طلسم سے بڑھ کر حیرت انگیز اور سائنس کے ہر شعبے سے کہیں زیادہ عجیب تر ہے۔ خود اس بات کی دلیل ہے کہ (۱) یہ نہ تو خود اپنے آپ وجود میں آسکتا ہے۔ (۲) اور نہ از خود چل سکتا ہے۔ (۳) اور نہ از خود باقی رہ سکتا ہے۔ کیونکہ مظاہر فطرت میں ایک لازوال تسلسل، باقاعدگی اور زبردست نظم و انتظام پایا جاتا ہے۔ اس لئے ماننا پڑتا ہے کہ ضرور اس نظام کائنات کے پیچھے ایک صاحب اختیار اور صاحب عقل و حکمت ذات کام کر رہی ہے۔

بقول شاعر۔

کوئی معشوق ہے اس پردہ زنگاری میں

امثال اور حیرت ناک سوالات

کیونکہ ایک معمولی سی گھڑی بغیر کسی ماہر فن بنانے والے کے نہ تو بن

سکتی ہے اور نہ چل سکتی ہے۔ تو بھلا یہ اتنا بڑا نظام کائنات از خود کیسے بن سکتا ہے یا چل سکتا ہے؟ اور باقی رہ سکتا ہے۔ مثلاً زمین جو ۲۵ ہزار میل کا ایک محیط ہے اور بڑی تیزی سے خلا میں گھوم بھی رہتی ہے۔ بلا کون سی قوت ہے جو اس کو گھما بھی رہی ہے اور تھامے ہوئے بھی ہے؟ زمین چاند سورج اور لاکھوں سیاروں کے درمیان فاصلے کا ایک خاص تناسب کس نے قائم کرر کھا ہے؟ زمین کے گھومنے کی ایک مناسب رفتار کی شرح جو ہمارے نظام جسم سے بھی مطابقت رکھتی ہے اور جس سے دن رات وجود میں آتے ہیں' یہ رفتار (Speed) کس نے مقرر کی ہے؟ سورج ایک مناسب مقدار میں روشنی اور گرمی کس کے حکم سے ہمیں پہنچا رہا ہے؟ ستاروں کی یہ روشنی اور ان کے طلوع وغروب میں یہ باقاعدگی کس کے حکم سے قائم ہے؟ نظام فلکی کے بے شمار اجزاء اور عناصر میں یہ خاص ترتیب اور باہمی ہم آہنگی کس کی حکمت اور صنعت ہے؟ رات ودن کس طرح ایک برتر قانون کے اندر جکڑے ہوئے اپنا اپنا کام وقت پر انجام دے رہے ہیں؟ گرمی سردی برسات کی مناسب مقدار اور اس میں ضروری تبدیلیاں کون کرتا رہتا ہے؟ تمام ملکوں کے لئے چاند اور سورج کے طلوع وغرب کے اوقات کس نے باندھ کر مقرر کئے ہیں؟ یہ تمام باتیں کس کی قدرت کاملہ اور حکمت بالغہ کی گواہی دے رہے ہیں؟ انسان کو یہ عقل کس نے دی ہے کہ وہ لکڑی کے تختوں کو جوڑ جاڑ کر' انہیں لوہے کی

کیلیں ٹھونک ٹھناک کر اور ان پر لوہے کی چادر چڑھا کر سمندروں کے عظیم فاصلوں کو طے کر کے رکھ دیتا ہے؟ پھر کون ہے جو بپھرے ہوئے سمندروں کی بے تاب موجوں کو خاص حدود سے آگے نہیں بڑھنے دیتا؟ وہ کون ہے کہ جو سمندروں کو ایک خاص گرمی مہیا کر کے پانی کے ایک خاص فاصلے تک اوپر لے جاتا ہے؟ پھر ایک خاص درجے کی سردی مہیا کر کے ان کو بادلوں کی شکل عطا فرماتا ہے؟ پھر ہوا کے دوش پر ان بادلوں کو اٹھوا کر ان علاقوں تک پہنچواتا ہے جہاں میٹھے پانی کی ضرورت ہوتی ہے اور پھر ایک بندھی ہوئی مقدار میں معین اوقات میں پانی برسا کر خشک اور مردہ زمین میں جان ڈال دیتا ہے اور اس طرح انسانوں' جانوروں' پرندوں کو روزی عطا فرماتا ہے۔ آخر یہ سارے ردوبدل' یہ سارے انتظامات کس حکیم کی حکمت اور کس قادر مطلق کی قدرت اور عظمت کی کھلی گواہی دے رہے ہیں۔

اس کے بعد پودوں کی زندگی کے رموز اور حقائق' حیوانی اور انسانی زندگی کے کرشمے، اور عجائبات ملاحظہ فرمائیں تو حیرت سے آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں۔ کیونکہ ہر زندہ جسم بے شمار ذروں اور کروڑوں خلیوں کا مجموعہ ہوتا ہے۔ ان میں ایک مخصوص ترتیب اور متعین ترکیب ہوتی ہے۔ ایک خاص درجہ حرارت قائم رہتا ہے جو زندگی کو برقرار رکھتا ہے پھر انہیں غذا کا نظام' اعصاب کا نظام' اولاد پیدا ہونے کا نظام اور

چھوٹے بڑے دوسرے بہت سے نظام' خواہشات کا نظام' سوچنے سمجھنے اور خطرات سے نمٹنے کا نظام' سونے جاگنے کا نظام' موت وحیات کا نظام ہوتا ہے اور پھر ہر نظام کے تحت بے شمار قوانین وضابطے ہوتے ہیں جو ہر وقت اپنا اپنا کام انجام دیتے ہیں۔ آخر اتنے پیچیدہ اور پر حکمت نظام اور ضابطے اور قوانین اور ان تمام نظاموں میں ہم آہنگی کس نے پیدا کی؟ اور کس نے ان نظاموں کو مقرر کیا اور چلایا؟ (ماجدی)

غرض ان آیات نے مصنوعات سے صانع پر استدلال کیا ہے اور یہی اصل ہے کہ عرفاء کے مراقبے کی (تھانوی)

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا۔ "خدا کے سارے کے سارے کام عجیب وغریب ہوتے ہیں اور راز ہی راز ہیں۔ اس طرح خدا نے بندوں پر اپنی حجت تمام کی اور اس طرح اس نے تمہیں اپنے آپ کو پہچنوایا ہے۔ (الکافی)

حضرت امام رضا علیہ السلام سے روایت ہے کہ جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ "عبادت یہ نہیں ہے کہ کثرت سے کھڑے ہوکر نمازیں پڑھی جائیں اور لمبے لمبے رکوع اور سجدے کھینچے جائیں۔ بلکہ عبادت یہ ہے کہ اللہ کے کاموں' اس کی باتوں' دلیلوں اور نشانیوں پر غور کیا جائے۔" (الکافی)

نفی شرک

اب اگر اس پورے نظام کائنات کو بنانے والی کئی ہستیاں ہیں تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ ایک بنانے والا ان سب کو بنانے کے لئے کافی نہ ہوا۔ اس سے بنانے والے کا عجز، نقص اور بے بسی ثابت ہوتی ہے۔ تو ایسے عاجز و ناقص ایسی عظیم کائنات کو بنا ہی نہیں سکتے۔

خدا نے اس آیت میں صرف ایک لفظ خلق فرما کر یہ بتا دیا کہ یہ تمام عظیم کائنات ایک معمولی ذرے کی طرح صرف مخلوق ہیں، خالق یا مدبر نہیں۔ اس لئے یہ اس لائق نہیں کہ ان کو خالق، مالک، رازق سمجھ کر پوجا جائے۔

اور ساری کائنات میں صرف ایک نظام اور ہم آہنگی کا ہونا واضح طور پر بتا رہا ہے کہ ساری کی ساری کائنات کسی ایک خالق کسی ایک صانع کا کارنامہ ہے۔ بقول اقبال۔

لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرے کا دل چیریں

سورۂ انعام (آیت ۱ سے ۶)

"سب تعریف اللہ ہی کے لئے ہے۔ جس نے آسمان و زمین کو پیدا کیا اور روشنی اور اندھیرے قرار دیئے۔ پھر بھی جنہوں نے حق کو نہیں مانا وہ دوسروں کو اپنا مالک اور پالنے والا قرار دیتے ہیں۔(۱) وہ (خدا) وہی تو ہے جس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا۔ پھر تمہارے لئے دنیوی زندگی کی ایک مدت مقرر کر دی۔ اور ایک اور مدت بھی ہے جو اس کے ہاں طے شدہ ہے۔ (یعنی قیامت تک کا وقت) مگر تم لوگ ہو کہ بس شک ہی میں پڑے رہتے ہو۔(۲) اور وہی (خدا) آسمانوں میں بھی ہے اور زمین میں بھی۔ (یعنی ہر جگہ موجود ہے) وہ تمہارے کھلے اور چھپے تمام حالات کو خوب اچھی طرح جانتا ہے اور اسے بھی جانتا ہے جو کچھ تم لوگ کیا کرتے ہو۔(۳) لوگوں کا حال تو یہ ہے کہ ان کے پالنے والے مالک کی دلیلوں اور نشانیوں میں سے کوئی دلیل اور نشانی ایسی نہیں ہے جو ان کے سامنے آئی ہو اور انہوں نے اس سے اپنا منہ نہ موڑ لیا ہو(۴) اس لئے اب جو حق بات (قرآن کی شکل میں) ان کے پاس آئی تو اسے بھی انہوں نے جھٹلا دیا۔ اب بہت جلد اس (قیامت اور جہنم) کے بارے میں

خبریں پہنچ جائیں گی جس کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے(۵) کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم ان سے پہلے کتنی ایسی قوموں کو ہلاک و برباد کر چکے ہیں۔ جن کا ان کے اپنے زمانے میں بڑا دور دورہ رہا ہے۔ ہم نے ان کو زمین میں وہ حکومت اور اقتدار بخشا تھا' جو تمہیں نہیں بخشا۔ ان پر تو ہم نے آسمانوں سے خوب خوب اپنی نعمتوں (بارش) برسائی تھیں۔ اور ان کے پیروں کے نیچے بھی (دولت کی) نہریں بہا دی تھیں پھر ان کے گناہوں کی وجہ سے ہم نے انہیں تباہ و برباد کر ڈالا اور ان کی جگہ دوسروں نسلوں اور قوموں کو اٹھایا"۔

تشریح

زمین و آسمان کی تخلیق خدا کے وجود کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔ اس لئے کہ کوئی مخلوق بغیر خالق کے وجود میں نہیں آسکتی۔ ایک دہریئے نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے پوچھا "لوگ اللہ کی عبادت کس طرح کرسکتے ہیں جبکہ وہ اسے دیکھ بھی نہیں سکتے؟" حضرت امامؑ نے فرمایا "خدا کا دیدار' ایمان (عقل) کی روشنی میں دل و دماغ سے کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ عقل خدا کا اثبات بالکل اسی طرح کرلیتی ہے جس طرح آنکھ کی دیکھی ہوئی چیز کا۔ خدا کی آیتوں' نشانیوں اور مخلوقات کو دیکھنا' کتاب الٰہی کو پڑھنا بھی خدا کی عظمت کو دیکھنا ہے۔ بلکہ خود خدا ہی کو دیکھ لینا ہے۔"

اس پر زندیق نے کہا "کیا خدا اس بات پر قادر نہیں کہ خود کو لوگوں پر ظاہر کردے تاکہ وہ اسے دیکھ لیں؟ اور اس طرح اس کا عرفان حاصل کرلیں؟ حضرت امامؑ نے فرمایا "تم خدا سے ایسی بات طلب کررہے ہو جو امر محال ہے۔ (یعنی عقلاً" ناممکن ہے) کیونکہ خدا کی ذات ہم سے بہت بلند وبالا ہے ہمارا اس کو آنکھوں سے دیکھ لینا یا ہاتھوں سے چھولینا کسی طرح ممکن ہی نہیں۔ اس لئے وہ ہمارے سامنے حجاب ہی میں رہے گا"۔
(کتاب امام جعفر صادق علیہ السلام مصنفہ محمد ابو زہرہ مصری)

ہر رنگ میں جلوہ ہے تری قدرت کا
جس پھول کو سونگھتا ہوں بو تیری ہے
انیس

جس طرح ہم کسی شاعر کو اس کے کلام سے' کسی آرٹسٹ کو اس کی تصویر سے' کسی کاریگر کو اس کی مصنوعات سے' کسی مصنف کا مولف کو اس کی تصنیف و تالیف سے' کسی استاد کو اس کے لیکچر یا تقریر سے' کسی طالب علم کو اس کے حل کئے پرچوں سے' کسی ایڈمنسٹریٹر کو اس کے انتظامات سے' کسی ڈاکٹر کو اس کے علاج سے' کسی حاکم کو اس کے انصاف سے' کسی عالم کو اس کے کردار سے پہچانتے ہیں' اسی طرح ہم خدا کو آسمانوں اور زمین کی تمام عظیم تخلیقات کے حوالے سے بخوبی پہچان سکتے ہیں۔

یہاں خلق سے مراد ایجاد کرنا ہے یعنی عدم سے وجود میں لانا۔ (قرطبی)

خدا نے ساری کائنات کی چیزوں کے دو نام دیئے ہیں۔ روشن اور تاریک۔ فلسفہ کی زبان میں ان دونوں چیزوں کو جوہر اور عرض کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ کائنات میں جوہر یا عرض' ہر چیز کا عدم سے وجود میں لانے والا صرف خدا ہے۔

امام رازی نے لکھا کہ خدا نے ظلمات یعنی اندھیروں کو تو جمع کے صیغے میں فرمایا اور نور یعنی روشنی کو واحد فرمایا۔ اس سے نتیجہ نکلا کہ حق کا صرف ایک راستہ ہے جبکہ گمراہیاں بے حد و حساب ہیں۔ (تفسیر کبیر)

امام رازی نے اس آیت سے دوسرا نتیجہ یہ نکالا کہ خود اپنی تعریف کرنا بندوں کے لئے تو عیب ہو سکتا ہے لیکن جس نے خدا کے لئے بھی اسے عیب سمجھا اس نے اللہ کو بندوں پر قیاس کیا۔ (تفسیر کبیر)

نیز یہ کہ خدا کا اپنی تعریف کرنا خود ہماری بھلائی کے لئے ہے تاکہ ہم اس کی معرفت حاصل کر سکیں۔ اور ان کی عظمتوں کو پہچان کر اس کی اطاعت کی طرف راغب ہوں اور اپنی تکمیل کر سکیں۔

آیت میں خدا نے حمد کو پہلے تو اپنے اسم ذات اللہ کے متعلق فرمایا اور پھر حمد کو اپنی صفات کے ساتھ موصوف کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ خدا کی ذات بھی لائق تعریف ہے اور اس کے تمام صفات بھی لائق

تعریف ہیں۔ (تھانوی)

آخری آیت سے امام رازی نے نتیجہ نکالا کہ ظاہری خوشحالی اور مادی ترقی حق پر ہونے کی دلیل نہیں ہوتی۔ دوسرا نتیجہ یہ نکالا کہ مادی خوشحالی اور ترقیاں قوموں کو بد اخلاقی اور ناانصافی کے برے انجام سے نہیں بچا سکتیں۔ (تفسیر کبیر)

عرفاء نے ان آخری آیتوں سے نتیجہ نکالا کہ ضد اور حق دشمنی ہو تو انسان کو کوئی دلیل فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔ اسی لئے اہل طریقت ضدی اور حق دشمن لوگوں کی طرف توجہ ہی نہیں دیتے۔ (تھانوی)

کیا یہ سب اتفاقات سے پیدا ہوتے ہیں؟

ہم مانتے ہیں کہ اتفاق بھی کوئی چیز ضرور ہوتی ہے۔ مگر اتفاقات اچھے بھی ہوتے ہیں اور برے بھی۔ پھر یہ کیوں ہوا؟ کہ انسان اور کائنات کی تخلیق میں تمام اچھے مواقع ہی جمع ہوئے اور برے اتفاقات نے چھوا تک نہیں؟ اس لئے ماننا پڑتا ہے کہ کوئی نگراں آنکھ ہے جو ہر چیز پر غالب ہے اور کوئی زبردست دماغ ہے جو مصروف عمل ہے جو تمام تعمیری مواقع ہی فراہم کرتا ہے اور ہر تخریب سے بچائے چلا جارہا ہے۔ پروفیسر ولیم میکرائیڈ نے لکھا:

"Can anyone seriously suggest that this directing and regulating power originated in chance encounters

of atoms? Can the stream rise higer than the Fountain"

"یعنی کیا کوئی شخص سنجیدگی سے یہ سوچ سکتا ہے کہ کائنات میں یہ نظم اور یہ ضبط عناصر کی اتفاقیہ ملاوٹ سے پیدا ہو گیا ہے؟ کیا کوئی نہر اپنے سرچشمہ سے اوپر کی سطح پر بہہ سکتی ہے؟"

فرانس تھامپس نے لکھا:

"All things by immoral power, near and far-Hiddenly to each other linked are. That their cannot stir a flower without trembling of a star."

"یعنی" تمام قریب اور دور کی چیزوں کو ایک لازوال طاقت نے مخفی طور پر ایک دوسرے سے باندھ رکھا ہے۔ جب تم ایک پھل کو چھیڑو گے تو آسمان پر کوئی ستارہ کانپ اٹھے گا"۔

حقیقت ایک ہے ہر شے کی خاکی ہو یا نوری ہو۔
لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرے کا دل چیریں
اقبال

شعاعی جنکشن

۱۸۹۴ء میں ایکسریز دریافت ہوئیں جو انسانی ہڈیوں کے آرپار ہو جاتی ہیں اور کئی انچ لوہے کے اندر سے گزر جاتی ہیں۔ ان شعاعوں نے دنیائے طب میں ایک تہلکہ مچا دیا۔ پھر یہ انسیر ملیکن نے ایک ایسی شعاع دریافت کی جو ریڈیم سے بھی زیادہ طاقتور ہے۔ پروفیسر آرتھر نے کا بجک

شعاعوں کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ شعاعیں عالم بالا سے زمین کی تخلیق سے بہت پہلے روانہ ہوئی تھیں جو اب زمین پر پہنچ رہی ہیں۔ اس سے کائنات کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ شعاعیں مقدار میں بہت کم ہیں مگر طاقت میں بہت زیادہ ہیں۔ پھولوں اور نباتات میں تنوع (Variety) انہیں شعاعوں کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔ جب یہ شعاعیں پھولوں اور پودوں کے بیجوں کے اندر سے آرپار گزرتی ہیں تو ان میں طرح طرح کے تغیرات پیدا ہوجاتے ہیں۔ ایک انچ فضا میں سے کروڑوں قسم کی شعاعیں ایک دوسرے کو کاٹتی ہوئی گزر رہی ہیں جو خوردبین سے دیکھی جاسکتی ہیں۔

انہیں شعاعوں میں تموج ایثری کی بدولت ہم ہزار میل دور کی باتیں دیکھ اور سن سکتے ہیں۔ ذرا سی آہٹ بھی ایتھر میں موجیں پیدا کردیتی ہے جس خدا نے ایتھر جیسی حساس اور نازک چیز کو پیدا کیا ہے وہی یہ کہہ سکتا ہے کہ:

"ہم انسان کے دل کے وسوسوں اور احساسات تک سے واقف ہیں"۔

وہی خدا یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ:

"حقیقتاً" اللہ ہر چیز کا خوب اچھی طرح سے سننے اور جاننے والا ہے"۔

ہم ان آیات کو امواج اثیری کے عمل سے بھی سمجھ سکتے ہیں۔

امپیریل کالج آف سائنس لندن کے پروفیسر ولیم انسان کے کان کی ساخت پر غور کر رہا تھا تو وہ بے ساختہ چیخ اٹھا۔

He who planted ears shall, He not hear?

جس اللہ نے کان جیسی چیز ایجاد کی کیا وہ خود نہیں سنتا؟

اتفاق سے تخلیقات کی دوسری نفی

تمام کائنات کی ترکیب بجلی کے چھوٹے چھوٹے ذرات یعنی الیکٹرون سے ہوئی ہے۔ الیکٹران یعنی منفیوں کا اختلاط بجلی کے مثبت ذرات یعنی پروٹون سے ہوتا ہے۔ اس مرکب کو نیوٹران کہتے ہیں۔ چند پروٹون ملکر ایٹم بناتے ہیں اور ایٹم کے مجموعہ کو مالیکول (Malecule) کہتے ہیں۔ ہر ایٹم اور ہر مالیکول بجلی کا ایک چھوٹا سا نہایت پیچیدہ اور حساس زندگی کا خزانہ ہوتا ہے۔ یہ اتنا پیچیدہ ہوتا ہے کہ ایک گھڑی یا ایک چھاپنے کی مشین اس کے سامنے بالکل سادہ سی چیز معلوم ہوتے ہیں۔ پھر ہر مالیکول سالمہ میں ماحول کے مطابق بدل جانے کی حیرت انگیز صلاحیت ہوتی ہے۔ کیا اتنی پیچیدہ حساس کروڑوں مشینیں ازخود اتفاقاً بن سکتی ہیں؟ کیا تخلیق کے اتنے پیچیدہ اور حیرت انگیز معجزے محض اتفاق سے ظاہر ہو رہے ہیں؟

ایک مغربی مفکر نے لکھا:

The ider of a mind behind and mind within seems as rational and working by hypothesis as any?

یعنی یہ خیال ایک دماغ کائنات کے اندر اور باہر مصروف عمل ہے ایک معقول اور قابل یقین تصور ہے---

وہ عمل جس نے انسانی دماغ جیسی پیچیدہ ترین چیز کو بنایا وہ کتنی عظیم عقل ہوگی۔ برناڈشا نے لکھا ہے کہ "کئی سال بعد انسانی عقل اتنی ترقی کر چکی ہوگی کہ ہماری موٹروں اور ہوائی جہازوں سے ہزاروں گنا زیادہ تیز رفتار سواریاں ایجاد ہو چکی ہوں گی اور جس طرح آج پتھر کے عہد کے آلات' برتن' منجنیقیں میوزیم میں سجا دی جاتی ہیں' اس زمانے میں ہماری موٹریں اور ہوائی جہاز زمانہ جہالت کی یادگار سمجھ کر عجائب گھروں میں رکھ دیئے جائیں گے"۔(برناڈشا)

قرآن میں کہا۔

"ہم جب کسی دلیل یا منظر کو مٹا دیتے ہیں تو اس سے بہتر یا ویسی ہی دلیل پھر پیدا کر دیتے ہیں"۔

اندھیروں کا وجود خدا کی رحمت ہے

اگر اندھیرے نہ ہوتے تو سورج کی گرمی سے پوری زمین پر آگ ہی آگ بھڑک اٹھتی۔ جاگتے جاگتے دماغ پھٹ جاتے۔ یعنی روشنی کی طرح اندھیرا بھی خدا کی بڑی رحمت ہے۔ خدا فرماتا ہے۔

"کیا تم دیکھتے نہیں کہ اللہ نے زمین پر سایہ پھیلا دیا ہے۔ اگر اللہ چاہے تو اس کو (زمین کو) ساکن بنا دے"۔(فرقان ۴۲)

بڑی عجیب بات یہ ہے کہ جب رات ہوتی ہے اور ہمارا سورج غروب ہوچکا ہوتا ہے۔ عین اسی وقت ہمارے سورج سے ہزاروں گنا بڑے اور زیادہ روشن سورج فضا میں موجود ہوتے ہیں۔ ان کروڑوں سورجوں کی موجودگی میں زمین پر اندھیرا چھا جانا خدا کی صناعی کا کتنا بڑا معجزہ ہے۔

سورۂ انعام (آیت ۷۱ تا ۷۳)

"ان سے پوچھو کہ کیا ہم اللہ کو چھوڑ کر ان چیزوں کو پکاریں جو نہ تو ہمیں کوئی فائدہ پہنچا سکتی ہیں اور نہ کوئی نقصان پہنچا سکتی ہیں؟ جبکہ خدا ہمیں سیدھا راستہ بھی دکھا سکتا ہے۔ تو کیا اب ہم الٹے پاؤں (حق) سے پھر جائیں؟ کیا ہم اپنی حالت اس آدمی کی سی کرلیں جسے شیاطین صحراؤں اور جنگلوں میں حیران و پریشان پھرائیں؟ جبکہ اس کے ساتھی اس کو سیدھے راستے کی طرف بلائے جا رہے ہوں، کہ ادھر ہماری طرف آجا۔ کہہ دیجئے کہ صحیح رہنمائی اور ہدایت تو صرف اللہ کی ہدایت ہے۔ اسی کی طرف سے ہمیں یہ حکم ملا ہے کہ تمام کائنات کے پالنے والے مالک کے سامنے سر اطاعت جھکا دیں(۷۱) (اس طرح کہ) نماز کو پابندی سے ادا کرتے رہیں اور خدا کی ہر نافرمانی سے بچتے رہیں۔ (کیونکہ) وہی تو ہے جس کی طرف تم سب اکٹھے سمٹ سمٹا کر جاؤ گے(۷۲) اور وہی (خدا) ہے جس نے آسمان اور زمین کو بالکل صحیح اور ٹھیک ٹھاک پیدا کیا اور پھر جس دن وہ کہے گا کہ (حشر) ہو جا، تو اسی وقت وہ ہو جائے گا (کیونکہ) اس کا حکم بالکل سچی حقیقت ہے۔ جس دن صور پھونکا جائے گا تو

اس دن ساری کی ساری' بادشاہی' حکومت یا حکمرانی (ظاہر بظاہر) صرف خدا کے لئے ہوگی۔ وہ ان دیکھی اور (دیکھی) سب کی سب باتوں کا اچھی طرح سے جاننے والا ہے۔ اور گہری مصلحتوں کے مطابق بالکل ٹھیک ٹھاک دانائی کے ساتھ کام کرنے والا ہے اور ہر بات سے پوری پوری طرح باخبر ہے"۔(۷۳)

تشریح

عظیم فلسفی نطشے جرمن فلسفی کہتا ہے کہ مجھے دو چیزیں سخت حیران کرتی ہیں پہلی' انسان کے اندر اچھائی اور برائی کا احساس' ہر مذہب' ملک' ملت' رنگ و نسل' قوم کا آدمی اپنے اندر بہت سی چیزوں کو اچھا سمجھتا ہے اور بہت سی برائیوں کو از خود برا سمجھتا ہے اور دوسری چیز جو مجھے حیران کر دیتی ہے وہ تاروں بھرا آسمان ہے۔

ذرا اندھیری رات میں آسمان کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھئے کہ ستاروں کے بلب کس شان سے جل رہے ہیں۔ نور اور تجلی کا سیلاب امڈ رہا ہے۔ کہکشاں کی شاہراہوں پر کروڑوں آفتاب کیسی بہار دکھلا رہے ہیں۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ آسمان نہیں بلکہ کسی عظیم الشان بادشاہ کا دارالحکومت ہے۔

"The universe is ruled by a mind whether it

be the mins of a maghematician or of an artist or of a poet or all of them. It is the one reality which gives meaning to the existance, enriches our daily faste, encourages or hope and energises us with faith where knowledge fails"

یعنی کائنات پر ایک زبردست دماغ حکومت کر رہا ہے اس سے بحث نہیں کہ وہ دماغ کسی ریاضی داں کا ہے یا مصور کا' یا کسی شاعر کا' یا سب کے سب کا' البتہ وہ دماغ ایک عظیم حقیقت ہے جو ہماری زندگی میں معنی بھی پیدا کرتا ہے اور ہماری امیدوں کو بھی ابھارتا ہے۔ پھر جہاں علم کی روشنی ناکام ہوجاتی ہے وہاں ہمارا اس پر یقین اور زیادہ مضبوط ہوجاتا ہے۔

پھر آئن اسٹائن لکھتا ہے۔

"He who can no longer pause to pionder and stand rapt is as good as dead and his eyes are closed"

یعنی وہ انسان جو کائنات کی تخلیق پر تعجب کرتے ہوئے نہیں ٹھہرتا' وہ اصل میں مردہ ہے اور اس کی آنکھیں بند ہوچکی ہیں۔

اقبال نے کہا۔

مردہ ہے مانگ کے لایا ہے فرنگی نفس
یوں تو کالج کا جوان زندہ نظر آتا ہے

قرآن نے کہا۔

"کیا یہ لوگ کائنات ارض و سما پر اور خدا کی دوسری مخلوقات پر غور نہیں کرتے۔ شاید ان کی موت قریب آگئی ہے"۔ (سورۂ اعراف ۱۸۵)

"We hardly knows which to admire the more, the mins that arranged nature, or the mind which interpred

یعنی ہم یہ فیصلہ نہیں کرسکتے کہ کس کی زیادہ تعریف کریں' اس دماغ کی جس نے فطرت کو بنایا' اس دماغ کی جس نے فطرت کی ترجمانی کی۔(علمائے فطرت کی)

خالق کائنات کی تخلیق میں تناسب اور تنوع بے انتہا ہوتا ہے۔ ایک حقیر ذرہ برقی سے ساری کائنات بنا ڈالی۔ ارب در ارب انسان پیدا ہو چکے مگر نہ ایک چہرہ دوسرے چہرے سے ملا اور نہ ایک دماغ دوسرے دماغ سے ملا۔ پھر پھولوں' پرندوں' چرندوں' درندوں کی بے شمار قسمیں' رنگ' خصوصیات اشکال انسانی کو حیران کردیتے ہیں۔

The universe looks more like a great thought than a great machine

یعنی یہ کائنات کوئی مشین نہیں بلکہ کسی شاعر کا زبردست تخیل معلوم ہوتی ہے۔ اس کائنات میں ایک عظیم دقیق اور عجیب صناعی سے عدل و توازن کو پیدا کیا گیا ہے۔ اے رب تیرے کام کس قدر حیرت انگیز ہیں۔

قرآن نے سچ کہا۔

"اللہ سے صرف علمائے (فطرت) مرعوب ہوتے ہیں"۔

گردش شمس و قمر' ستاروں کی گردش' قلب انسانی کی حرکت' پھیپھڑوں کا تنفس' ان سب چیزوں کو ایک زبردست تناسب' حیرت انگیز ہم آہنگی اور موزونیت' عجیب و غریب نظم وضبط پایا جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے ہر کام ٹھیک ٹھاک انجام پاتا ہے۔ اگر ذرا سا بھی خلل ہوجائے تو پوری کائنات درہم برہم ہوکر رہ جائے۔ غرض یہ کائنات کیا ہے؟ ایک بالکل ٹھیک اور مناسب طریقہ سے باندھا ہوا نظام ہے۔ ساری کائنات میں زبردست نظم و ارتباط ہے۔ جس میں خوشگوار اختلاف (Variety) ہے۔ یہ ایک صداقت ہے جس کی لاکھوں تفسیریں ہیں۔

مغربی مفکر سیموئیل راجرز نے لکھا۔

"اللہ کی وہ مشیت جو قطرے آنسو بنا کر آنکھ سے لڑھکا دیتی ہے' وہی مشیت زمین کو فضا میں تھامے ہوئے ہے اور ستاروں کو ان کی مقرر گزرگاہوں پر چلاتی بھی ہے اور ان کی رہنمائی بھی کرتی ہے"۔

خدا نے فرمایا۔

"اللہ نے آسمان کو فضا میں اٹھا کر کائنات میں توازن پیدا کردیا ہے"۔(سورہ رحمٰن)

سیموئیل راجرز لکھتا ہے۔

We are at loss to know which to admire, the more the mathematical accuracy of the Universe or the beauty of its design.

یعنی ہم حیران ہیں اور فیصلہ نہیں کرسکتے کہ کس چیز کی زیادہ تعریف کریں؟ اس حسابی عدل و توازن کی جو فطرت کے اندر موجود ہے یا اس خوبصورت ساخت کی جو کائنات میں پایا جاتا ہے۔

اللہ کا لفظ الہ سے بنا ہے جس کے معنی ہی حیران ہونے کے ہیں۔ یہی حیرانی خدا کی معرفت کی ابتداء ہے۔ جس قدر کائنات کی تخلیقات کی تفصیلات، حقائق اور دقائق پر انسان غور کرے گا اتنی ہی اس کی حیرت بڑھتی چلی جائے گی۔ یہی حیرانی علم کی انتہا ہے۔ اس حیرت سے خدا کی عظمت کا احساس جنم لیتا ہے اور اس کا نتیجہ خدا کی محبت ہے۔

کسی نے ڈاکٹر اقبال سے پوچھا کہ علم کی انتہا کیا ہے؟ فرمایا "حیرت" پھر پوچھا عشق کی انتہا کیا ہے؟ فرمایا "عشق کی کوئی انتہا نہیں ہے" پوچھنے والے نے اعتراضا" کہا کہ پھر آپ نے یہ مصرعہ کیوں کہا۔

تیرے عشق کی انتہا چاہتا ہوں

علامہ اقبال نے فرمایا۔ "حضرت آپ نے دوسرا مصرعہ تو پڑھا ہی نہیں۔ جس میں اپنی حماقت کا اعتراف کررہا ہوں۔"

مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں

جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرمایا کرتے تھے۔

رب زدنی تحیرا" فیک

"خدایا اپنے بارے میں میری حیرانی کو بڑھاتا ہی چلا جا"۔

کائنات کا بالکل ٹھیک ٹھاک پیدا ہونا اور ٹھیک اندازوں پر کام کرنا واضح طور پر بتاتا ہے کہ کائنات پر کسی عظیم شعور کی حکومت ہے۔ اسی لئے آئن اسٹائن جیسا عظیم سائنس دان لکھتا ہے۔

"کائنات پر ایک عظیم شعور کی حکومت ہے خواہ یہ شعور کسی ماہر ریاضیات کا سمجھا جائے یا کسی مصور یا شاعر کا۔ یہی حقیقت ہے جو ہستی کو معنی خیز بناتی ہے۔ ہماری روزمرہ کی زندگی میں رونق پیدا کرتی ہے۔ ہماری امیدوں کو بڑھاتی ہے اور جب ہمارا علم ناکام رہ جاتا ہے تو یقین کے ساتھ ہمیں قوت بخشتی ہے"۔

نظریہ کوانٹم کے موجد پروفیسر ملپنک نے کہا۔

"میں شعور کو ایک بنیادی حقیقت سمجھتا ہوں اور مادہ کو شعور کا نتیجہ سمجھتا ہوں۔ ہم شعور سے آگے نہیں جاسکتے۔ ہر چیز جس کا ہم ذکر کرتے ہیں یا جس کو موجود تصور کرتے ہیں' اس کا موجود ہونا کسی شعور پر ہی منحصر ہے"۔

سر جیمز جینز اپنی کتاب "پر اسرار کائنات" میں لکھتے ہیں "کائنات مادی تشریح کی متحمل نہیں ہوسکتی کیونکہ کائنات کی حقیقت ایک خیال سے زیادہ نہیں۔ اب ہمیں پوری کائنات ایک بڑی مشین کے بجائے ایک

بڑے تصور کی شکل میں نظر آنے لگی ہے۔ اب شعور کوئی ایسی چیز نہیں جو مادہ کی دنیا میں اتفاقاً" داخل ہو گیا ہو۔ بلکہ ہمیں شعور ہی کو مادہ کی دنیا کا خالق اور حکمران قرار دینا چاہئے۔ ہمارے اپنے شعور کو نہیں بلکہ اس شعور کو جس کے اندر وہ سالمات ہیں جن سے ہمارا شعور صورت پذیر ہوا ہے۔ جدید علم ہمیں مجبور کر رہا ہے کہ ہم اپنے پہلے جلد بازی سے قائم کئے ہوئے ان تاثرات پر کہ ہم اتفاقاً" ایسی دنیا میں آپہنچے جو زندگی سے کوئی سروکار نہیں رکھتی یا زندگی سے دشمنی رکھتی ہے' نظرثانی کریں۔ اس لئے کہ اب مادہ بے حقیقت چیز ثابت ہو گیا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ کائنات ایک ایسی منظم ہستی کا پتہ دیتی ہے جو ہمارے شعور سے کچھ مشابہت رکھتی ہے جس حد تک ہمیں علم ہو سکا ہے جذبات' اخلاق احساس اور حسن کے اوصاف کے لحاظ سے تو نہیں' بلکہ انداز فکر کے لحاظ سے جسے ہم کسی بہتر لفظ سے تعبیر نہ کر سکنے کی وجہ سے ریاضیاتی انداز فکر کہہ سکتے ہیں"۔

غرض معلوم ہوا کہ کائنات آخری حقیقت شعور ہے اور اس شعور کے اوصاف جلال و جمال اس کی خلاقیت' قدرت رحمت' ربوبیت اس کی تخلیقات سے آشکار ہیں۔ اس لئے ہم یہ ماننے پر مجبور ہیں کہ کائنات کا شعور ہماری طرح خودشناس اور خود آگاہ ہے۔ لہٰذا وہ ایک شخصیت یا ایک خود شعوری ہے۔ اس خودشعوری نے کائنات کو پیدا کیا ہے۔

ڈریش جیسا عظیم ماہر حیاتیات نے بتایا ہے کہ ہر جاندار کے اندر

ارتقائی رجحانات ایک مقصد اور وہ مدعا یا Plan صرف جاندار ہی کے جسم کے اندر نہیں بلکہ ساری کائنات کے اندر کام کررہا ہے۔ حتیٰ کہ پوری کائنات کا ارتقا بھی اسی کے مطابق ہورہا ہے اور انسان بھی اسی پلان کے مطابق خودشعوری کے وصف سے بہرہ ور کیا گیا ہے۔ اسی لئے ڈریش نے لکھا۔

"ساری کائنات کی بھی ایک اینٹی لیجی(شعور) ہے۔ جسے لوگ خدا کہتے ہیں اور بعض سائنس دان پوری کائنات کو بھی ایک زندہ جسم قرار دیتے ہیں"۔چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

کل من فی السموات والارض الا اتی الرحمان عبدا"

یعنی جو کچھ بھی کہ زمین اور آسمانوں میں موجود ہے وہ سب اللہ کے ایک بندے (کی طرح) ہیں۔

غرض اب سائنس نے بھی مان لیا کہ کائنات کی حقیقت ایک شعور پر مبنی ہے۔ کیونکہ بیسویں صدی کے سائنس کے نئے انکشافات مثلاً نظریہ اضافیت اور نظریہ کوانٹم اور علم حیات کے بعض حقائق نے سائنس کے اس بت کو خود توڑ دیا کہ کائنات کی حقیقت صرف مادہ ہے۔ کیونکہ جدید تحقیقات نے مادہ کو جو کبھی ٹھوس' سادہ' روشن حقیقت کا درجہ دے رکھا تھا' اب باقی نہ چھوڑا۔ اب مادہ ایک بے حقیقت چیز ثابت ہوگیا۔

ڈاکٹر جوڈ نے لکھا:

"جدید مادہ ایک ایسی حقیقت ہے جو ہاتھ میں نہیں آسکتی۔ یہ فاصلہ اور وقت کے مرکب کا ایک ابھار ہے۔ یا برقی رو کا ایک جال ہے۔ یا امکان کی ایک لہر ہے جو دیکھتے ہی دیکھتے فنا کے اندر کھو جاتی ہے۔ اس لئے اکثر اوقات اسے مادہ کے بجائے دیکھنے والے کے شعور کا ہی ایک پھیلاؤ سمجھا جاتا ہے"۔

تخلیق اور جسم انسانی

(القرآن)

"وہی خدا ہے جس نے تمہیں ایک جاندار (شخص) سے پیدا کیا اور اس (کی جنس) سے اس کا جوڑا بنایا۔ تاکہ وہ اس کے پاس سکون پائے۔ پھر جب اس (مرد) نے اس (عورت) کو ڈھانک لیا' تو اس عورت نے اس کا ہلکا سا حمل (بوجھ) لے لیا' جسے لئے لئے وہ چلنے پھرنے لگی۔ پھر جب اس کا حمل کا بوجھ بڑھا تو ان دونوں (میاں بیوی) نے مل جل کر اپنے پالنے والے مالک' اللہ سے دعا مانگی کہ اگر تونے ہمیں ایک صحیح سالم' اچھا سا بچہ عطا فرمادیا' تو ہم ضرور تیرے شکرگزاروں میں سے ہوجائیں گے۔(۱۸۹) مگر جب اللہ نے ان کو ایک اچھا سا صحیح سالم بچہ عطا کردیا' تو وہ دونوں خدا کی اس بخشش وعطا میں دوسروں کو خدا کا شریک ٹھہرانے لگے۔ جبکہ اللہ ان چیزوں سے بہت ہی بلند ہے' جنہیں یہ لوگ اللہ کا شریک ٹھہراتے ہیں۔(۱۹۰) کیا وہ لوگ ان کو خدا کا شریک ٹھہراتے ہیں' جو خود کوئی چیز بھی پیدا نہیں کرتے' بلکہ وہ تو خود پیدا کیے جاتے ہیں؟(۱۹۱) جو نہ تو ان شریک ٹھہرانے والوں ہی کی کوئی مدد کرسکتے ہیں' اور نہ خود

اپنی ہی مدد کرنے پر قدرت رکھتے ہیں۔(۱۹۲) اگر تم انہیں سیدھے راستے (یعنی خدا کی طرف) بلاؤ' تو وہ تمہارے پیچھے نہ آئیں گے' چاہے تم انہیں پکارو یا خاموش رہو۔(۱۹۳) حقیقت یہ ہے کہ جن جن کو تم لوگ اللہ کو چھوڑ کر (اللہ سمجھ کر) مدد کے لئے پکارتے ہو' وہ تو تمہارے ہی جیسے اللہ کے غلام ہیں' اچھا تو ان کو پکارے جاؤ' ان سے دعائیں مانگے جاؤ' تب جانیں کہ وہ تمہاری حاجتیں پوری کریں (یا) تمہاری پکار اور دعاؤں کا جواب ہی دے دیں۔ اگر تم دعوے میں سچے ہو۔(۱۹۴) حقیقت میں میرا سرپرست' حامی اور مددگار تو خدا ہے جس نے یہ کتاب (قرآن) اتاری ہے' اور وہ تمام اچھے کام کرنے والے لوگوں کی سرپرستی اور مدد کرتا ہے۔(۱۹۶) (برخلاف اس کے) تم خدا کو چھوڑ کر جنہیں (خدا سمجھ کر) پکارتے ہو' وہ نہ تو تمہاری ہی کچھ مدد کرسکتے ہیں' اور نہ خود اپنی ہی مدد کرسکتے ہیں۔(۱۹۷) بلکہ اگر تم انہیں سیدھے راستے پر آنے کی دعوت بھی دو' تو وہ سن بھی نہیں سکتے۔ اگرچہ بظاہر تم کو ایسا نظر (ضرور) آتا ہے کہ وہ تمہاری طرف دیکھ رہے ہیں۔ حالانکہ ان کو تو دکھائی بجھائی تک نہیں دیتا"۔(۱۹۸) (سورۂ اعراف آیت نمبر۱۸۹

سے ۱۹۸)

تشریح :

اس آیت سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ انسان کے پاس تو ہاتھ' پیر' آنکھ' کان اور عقل جیسی عظیم دولتیں موجود ہیں جبکہ یہ بے جان بت تو ان چیزوں سے بھی محروم ہیں۔ پھر انسان اتنا گیا گزرا کیوں ہوگیا کہ اپنے سے کمتر چیزوں کی عبادت کرتا ہے۔(تفسیر کبیر)

یہ بھی انسانی فطرت ہے کہ جب اسکا بچہ ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے تو اس کی ساری امیدیں خدا سے وابستہ رہتی ہیں۔ ہر انسان کا وجدان اور فطرت گواہی دے رہی ہوتی ہے کہ یہ بات صرف ایک خدا کی ذات کے ہاتھ میں ہے کہ اگر وہ چاہے گا تو صحیح سالم بچہ عنایت کرے گا۔ مگر یہ انسان کی مشرکانہ ذہنیت اور رسم پرستی ہے کہ بچہ ہوجانے کے بعد وہ شکریے کے لئے نذریں نیازیں کسی دیوی' کسی اوتار کے نام پر چڑھاتا ہے۔

یاد رہے کہ مشرکانہ مذاہب میں تین چیزوں کی عبادت کی جاتی ہے۔

۱۔ اجسام۔تصاویر۔علامات

۲۔ اشخاص یا ارواح یا جن وغیرہ جن کی نمائندگی بتوں اور تصویروں سے

کی جاتی ہے۔

۳۔ مشرکانہ اعتقادات جو ان چیزوں کی عبادت کرنے کی اصل وجہ ہوتے ہیں۔ قرآن ان تینوں پر طرح طرح کی ضربیں لگا رہا ہے۔

جسم انسانی کے معجزات

انسانی بدن خدا کے وجود' قدرت حکمت اور عظمت کی دلیل ہے جس کو دیکھ کر عقل خدا کے سامنے سر بسجود ہو جاتی ہے۔

ا۔ انسانی بدن کی ترکیب خلیوں سے ہوتی ہے۔ آغاز میں یہ ایک خلیہ ہوتا ہے۔ پھر دو چار آٹھ ہو کر بدن کو بناتا چلا جاتا ہے۔ کچھ خاص خلیے ہیں جو آنکھ' ناک اور دوسرے اعضاء بناتے ہیں۔ یہ آج تک نہیں ہوا کہ بے عقل خلیے ناک کی جگہ کان اور کان کی جگہ ناک بنا دیں۔ یہ اس لئے کہ کائنات کا ذرہ ذرہ خدا کی نگرانی میں کام کر رہا ہے اور اس کے حکم کے سامنے سر جھکائے رہتا ہے۔ خدا فرماتا ہے۔

"آسمانوں اور زمین کی ہر چیز اللہ کے سامنے سر تسلیم خم کئے ہوئے ہے۔" (آل عمران ۸۳)

کیسے ممکن ہے کہ اتنی پیچیدہ اور عمدہ تخلیق بغیر کسی بنانے والے کے بن جائے؟ انسانی جسم کی تصویر (Painting) از خود نہیں بن سکتی۔ اس

لئے کہ اس میں بلا کا توازن اور حسن موجود ہے جو اتفاقاً" یا از خود پیدا نہیں ہو سکتا۔ جب جسم کی نقل کاغذ پر از خود ممکن نہیں تو بھلا انسانی جسم از خود کیسے بن سکتا ہے؟

سوچئے کہ رحم مادر میں خلیوں نے تمہیں انسانی شکل ہی کیوں دی؟ انسانی پیٹ سے آج تک بکری کیوں نہیں پیدا ہوئی؟ کبوتر کے انڈوں سے تیتر کیوں نہ نکلے؟ خدا فرماتا ہے۔

"وہ صرف اللہ ہی ہے جو ماؤں کے پیٹوں میں تمہاری صورتیں بناتا ہے"۔(آل عمران ۶۵)

اقبال نے کیا خوب کہا۔

کیا ہے تجھ کو کتابوں نے کور ذوق اتنا
صبا سے بھی نہ ملا تجھ کو بوئے گل کا سراغ

۳۔ انسانی جسم میں چار ارکان ہیں........ آگ، ہوا، مٹی، پانی

چار اجزاء ہیں........ صفرا، خون، بلغم، سودا

نو طبقات ہیں....... سر، منہ، گردن، سینہ، پیٹھ، کمر، ران، ٹخنا، پاؤں۔

ستون یعنی ۲۴۸ ہڈیاں ہیں۔

رسیاں یعنی ۷۵۰ پٹھے ہیں۔

خزانے یعنی دماغ' پھیپھڑے' حرام مغز' دل' جگر' معدہ' آنتیں' گردے۔

راستے یعنی ۳۶۰ رگیں ہیں۔

نہریں یعنی ۳۹۰ وریدیں ہیں۔

دروازے یعنی آنکھیں' کان' ناک' پستان' منہ' شرمگاہیں۔

انسانی جسم کا باورچی معدہ ہے جو غذا پکاتا ہے۔

ایک عطار ہے جو غذا کا جوہر نکال کر اس کو بدن کا حصہ بناتا ہے۔

ایک ڈاکٹر ہے جو غذا میں تیزاب ملا رہا ہے۔

ایک بھنگی ہے جو انتڑیاں' جلد' گردے اور پھیپھڑے میں جو جسم کی غلاظت کو باہر پھینکتا ہے۔

ایک صناع ہے جو خون کو گوشت میں تبدیل کر رہا ہے۔

ایک بھٹہ ہے جو ہڈیوں کو اینٹوں کی طرح پکا کر مضبوط کر رہا ہے۔

ایک جولاہا ہے جو اعصاب اور جھلیاں بن رہا ہے۔

ایک درزی ہے جو زخموں کو سی رہا ہے۔

ایک کاشت کار ہے جو جسم کے اوپر گھاس کی طرح بال اگا رہا ہے۔

ایک رنگ ساز ہے جو دانتوں کو سفید' بالوں کو کالا اور خون کو سرخ

رنگ دے رہا ہے۔

کوئی آرٹسٹ ہے جو ماں کے رحم میں خوبصورت شکل بنا رہا ہے۔ پھر انسان کی خصوصیات کو دیکھئے کہ وہ شیر کی طرح بہادر، خرگوش کی طرح ہوشیار، کوے کی طرح چالاک، الو کی طرح خود فراموش، لومڑی کی طرح مکار، بھیڑ کی طرح سادہ، ہرن کی طرح تیز رفتار، کچھوے کی طرح سست، اونٹ کی طرح مطیع، چیتے کی طرح پھاڑ ڈالنے والا، بلبل کی طرح گویا، گدھے کی طرح بد آواز، مرغی کی طرح مفید، چوہے کی طرح مضر، گھوڑے کی طرح وفادار، سانپ کی طرح خطرناک، مور کی طرح خوبصورت، گدھ کی طرح نوچنے والا، ہاتھی کی طرح ذمہ دار، پھول کی طرح نازک مزاج، کانٹے کی طرح چبھنے والا، نہروں کی طرح رواں، نباتات کی طرح لہلہانے والا، میدان کی طرح سپاٹ، پہاڑ کی طرح مضبوط اور بلند، ہوا کی طرح ہلکا، صبح کی طرح خوشگوار، بارش کی طرح رونے اور برسنے والا، اندھیروں کی طرح خوفناک، روشنی کی طرح راستہ دکھانے والا، زندگی کی طرح بیدار، موت کی طرح خوفناک، بہار کی طرح پر لطف، گرمی کی طرح جوشیلا، برف کی طرح ٹھنڈا، آگ کی طرح گرم مزاج، خدا کی طرح بردبار اور شیطان کی طرح بد معاش ہوتا ہے اسی لئے حضرت علیؑ نے فرمایا۔

"اے انسان تو خود کو ایک چھوٹا سا کیڑا سمجھتا ہے جبکہ تیرے اندر ایک عالم اکبر چھپا ہوا ہے۔"

کیا اتنی عظیم پیچیدہ عبرتناک جامع، ہمہ گیر مخلوق ازخود اتفاقاً" پیدا ہوسکتی ہے؟ کیا اس کے اندر اتنے کچھ صفات اور نظام ازخود جنم پاکر باقاعدگی سے ازخود کام کرسکتے ہیں؟ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ اتفاقاً" ایک ڈکشنری چھپ کر پریس سے نکل آئی تو کوئی انسان اس کو ماننے پر تیار نہ ہوگا۔ جبکہ انسان کی تخلیق تو ایک ڈکشنری سے کہیں زیادہ پیچیدہ ہوتی ہے۔ وہ ازخود کیسے پیدا ہوسکتا ہے؟ اندھی فطرت کس طرح اتنے کچھ منظم مرتب جامع کام انجام دے سکتی ہے؟

اعضاء کے نظام کی چند حکمتیں

۱۔ ہمیں گہری نیند میں کوئی شور بیدار نہیں کرسکتا لیکن ماں کو بچے کی معمولی سی آواز جگا دیتی ہے۔

۲۔ کتا موٹروں، گاڑیوں کے شور سے نہیں اٹھتا مگر کسی اجنبی آدمی کی گھر کے اندر ہلکی سی آہٹ سے چونک اٹھتا ہے۔

۳۔ ہم جہاز میں آرام سے سو رہے ہوتے ہیں مگر جوں ہی جہاز کا انجن بگڑ جاتا ہے تو دفعتاً" تمام مسافر جاگ اٹھتے ہیں کیونکہ انسان کے دماغ کا ایک

حصہ بیدار رہ کر تمام واقعات اور خطرات کا مطالعہ کرتا رہتا ہے۔ جوں ہی خطرہ حملہ کرتا ہے یہ محافظ ہمیں جگا دیتا ہے۔ خدا فرماتا ہے۔

"تم جہاں کہیں بھی ہو اللہ تمہارے ساتھ ہے" (حدید ۴)

۴۔ انگڑائی یعنی لمبی لمبی سانس صبح کو اس لئے آتی ہے کہ رات کو خون کی کافی مقدار دل کے کام کو جاری رکھنے کے لئے پھیپھڑوں میں جمع ہو جاتی ہے۔ اب جاگنے کے بعد کیونکہ دوسرے اعضاء کو بھی کام کرنا ہوتا ہے اس لئے ان کو خون کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے جماہی سے پھیپھڑے سکڑتے ہیں اور اس طرح جمع شدہ خون یہاں سے نکل کر تمام جسم میں پھیل جاتا ہے۔ اس طرح تمام اعضاء کام کرنے لگتے ہیں اور چہرہ حسین اور شگفتہ ہو جاتا ہے۔

۵۔ آنکھ کی پتلی ایک سوراخ ہے جس سے روشنی گزرتی ہے اگر روشنی زیادہ ہو تو پتلی سمٹ کر چھوٹی ہو جاتی ہے اور اگر روشنی کم ہو تو پتلی پھیل جاتی ہے۔ تاکہ زیادہ روشنی اندر جا سکے۔ (سبحان اللہ)

۶۔ آنسو آنکھوں کو صاف رکھتے ہیں۔

۷۔ آنکھ اسلئے بار بار جھپکتی ہے کہ نمی آنکھ کے ہر حصے تک پہنچ سکے۔

۸۔ آنکھ میں سات پردے ہیں جو وریدوں کے ذریعہ آنکھ کو غذا پہنچاتے

ہیں۔

۹۔ آنکھ کے لینز شیشے کی طرح صاف شاف ہیں' ان میں سے روشنی گزر جاتی ہے اور آنکھ سے گزرنے والی شعاعیں مرکز بصارت پر جاکر ٹھہرتی ہیں۔ وہاں تاروں کے ذریعہ دماغ میں ارتعاش پیدا ہوتا ہے اس طرح عکس دماغ پر منتقل ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے دماغ دیکھتا ہے۔

۱۰۔ آنکھ کے آخری طبقے میں تیس لاکھ تھمیں اور تین کروڑ ستون ہیں۔

۱۱۔ آنکھ کی مشینری نہایت پیچیدہ ہے۔ کیا اتنی پیچیدہ چیز ازخود بن سکتی ہے؟ اگر آنکھ میں کوئی خرابی ہوجائے تو ۲۵ سال تعلیم حاصل کرنے کے بعد' آنکھوں کے ڈاکٹروں کی تحقیقات کا نچوڑ جاننے والا ڈاکٹر اس کا علاج کرسکتا ہے۔ جب آنکھ کو صرف ٹھیک کرنے کے لئے اتنا کچھ علم اور تجربہ درکار ہے تو اس کو ازسرنو بنانے اور ایجاد کرنے اور اس میں نازک توازن برقرار رکھنے کے لئے کتنا علم اور حکمت درکار ہوگی؟

خدا نے فرمایا۔ "ہم نے انسان کو مرد اور عورت کے مخلوط نطفے سے بنایا اور اس کو سننے اور دیکھنے کی طاقت عطا کی"۔ (دہر-۲)

۱۲۔ کان کی اندرونی دیواریں ایک بدبودار گوند خارج کرتی ہیں تاکہ گرد وغبار اور کیڑے مکوڑے اس میں پھنس جائیں اور سوتے میں بھی کوئی

چیونٹی وغیرہ کان میں نہ گھس سکے۔ اس کڑوے گوند کے آگے ایک پردہ ہے۔ اس کے آگے تین ہڈیاں زنجیر کی طرح ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہیں۔ جس طرح موٹر کے اسپرنگ ہچکولوں کو برداشت کرتے ہیں' اسی طرح یہ ہڈیاں اونچی اور سخت آوازوں کو نرم کرکے کان کے اندر پہنچاتی ہیں۔ ان ہڈیوں کے آگے ایک طبل ہے جسکے پیچھے پانی ہے۔ جس میں چھوٹے چھوٹے بال یا تار ہیں۔ آواز طبل سے ٹکرا کر ان تاروں کو ہلاتی ہے۔ یہ تار تین ہزار سے زیادہ ہوتے ہیں۔ ہر تار ایک خاص آواز کو خاص طریقے سے ہل کر اس آواز کو دماغ میں ایک نئی راہ سے پہنچاتا ہے۔ اس لئے ہم ایک ہی وقت میں تین ہزار آوازیں سن سکتے ہیں۔ کیا اتنا پیچیدہ پر حکمت' نازک' بامقصد نظام ازخود وجود میں آسکتا ہے؟

۱۳۔ آواز کا مطالعہ کیجئے تو ہوائی نالی کے منہ پر دو تار لگے ہیں جن کے چاروں طرف ایک جالی ہے۔ جب ہم بولتے ہیں تو پھیپھڑوں کی ہوا ان تاروں سے ٹکرا کر آواز میں تبدیل ہوجاتی ہے۔ پھر یہ کہ ان کی بناوٹ کچھ اس طرح کی ہے کہ سانس لینے سے بھی اس میں آواز پیدا نہیں ہوتی۔ جیسے اگر کسی سیٹی کو منہ میں لے کر آہستہ سے پھونکیں تو آواز نہ نکلے گی۔ جب زور سے پھونکیں گے تو آواز نکلے گی۔ اور جس طرح رباب

کے تار اگر ڈھیلے ہوں تو آواز موٹی اور بھدی نکلے گی اور اگر تار کھنچے ہوئے ہوں تو آواز صاف نکلے گی۔ اسی طرح موٹی آواز نکالتے وقت یہ تار ڈھیلے پڑجاتے ہیں اور صاف آواز نکالتے وقت یہ تار تن جاتے ہیں۔ اگر کوئی گویا گانا گا رہا ہو اور آپ اس کے گلے پر ہاتھ رکھیں تو اس کا گلا تنا ہوا ہوگا۔ بتایئے کہ ایسا نازک اور متوازن' پیچیدہ نظام ازخود اتفاقاً" وجود میں آسکتا ہے؟ اچھے سے اچھا انجینئر آج بھی کسی مجسمے سے اس طرح کی متوازن اور متفرق آوازیں ازخود نہیں نکلوا سکتا۔

۱۴۔ انسانی جسم کی پیدائش کا بھی عجیب اور بہت ہی پیچیدہ نظام ہے۔ انسان خلیوں سے بنا ہے اور ہر خلیہ تقسیم ہو کر بھی مکمل رہتا ہے۔ یہ خلیہ اصل میں ایک چھوٹا سا دانا ہے۔ جس میں ایک کالا دھبہ ہوتا ہے۔ اس کو جتنا تقسیم کریں گے تو ہر حصے میں یہ کالا دھبہ ضرور موجود رہے گا۔ یہی خلیہ ماں کے رحم میں موجودہ ہوتا ہے۔ مگر یہ خلیہ مرد کے نطفہ کے بغیر تقسیم نہیں ہو سکتا۔ جیسے ہی مرد کا نطفہ اس سے آکر ملتا ہے' یہ خلیہ تقسیم در تقسیم ہو کر بچہ کی تعمیر شروع کر دیتا ہے۔ کچھ خلیے تقسیم ہو کر کان بناتے ہیں اور کچھ جگر اور دل بناتے ہیں۔ مگر کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ دل کی جگہ کان بن جائے اور کان کی جگہ ناک بن جائے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے

کہ کوئی صاحب حکمت وقدرت اس کی نگرانی کررہا ہے۔

پھر کتنی عجیب بات ہے کہ انسان کا نطفہ آکسیجن ہائیڈروجن' کاربن' کبریت' فاسفورس' پوٹاش' چونا اور فولاد سے ملکر بنتا ہے۔ ان میں سے کسی چیز میں نہ عقل ہے نہ حواس نہ احساس۔ اب یہ کس کا فن تعمیر ہے کہ ان بے جان' بے حس چیزوں میں حس حواس' احساس' عقل' شعور' ادراک جیسی اعلیٰ اور نازک ترین چیزیں پیدا ہوجاتی ہیں۔ خدا نے فرمایا۔

"ہم نے انسان کو ملے جلے ہوئے نطفے سے بنا کر اس کو سننے اور دیکھنے والا بنادیا تاکہ ہم اس کا امتحان لیں"۔(دہر۔۲)

۱۵۔ انسانی غذا کا نظام بھی نہایت دقیق' پیچیدہ اور پرحکمت ہے۔ انسان جب کمرے میں بیٹھا ہوتا ہے تو ایک گھنٹہ میں پچیس ہزار مکعب سینٹی میٹر آکسیجن استعمال کرتا ہے۔ کھانے کے بعد ۳۶ ہزار مکعب' ورزش کرتے ہوئے' ۸۰ ہزار مکعب استعمال کرتا ہے کیونکہ سردیوں میں جسم کو گرم رکھنے کے لئے زیادہ آکسیجن درکار ہوتی ہے اس لئے سردیوں میں بھوک بڑھ جاتی ہے۔

ایک آدمی روزانہ تین پونڈ غذا کھاتا ہے اس طرح تمام دنیا کے

انسان ہر روز سات ارب پونڈ یعنی آٹھ کروڑ پچاس لاکھ من غذا کھاتے ہیں۔

جسم میں حرارت جسم کے رقبے کے مطابق ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لمبے آدمی کو چھوٹے آدمی کے مقابلے میں زیادہ بھوک لگتی ہے۔

حلق سے اتر کر غذا ایک تھیلی جسے معدہ کہتے ہیں' اس میں پہنچتی ہے جس کی دیواروں سے ایک رس نکلتا ہے جو ترش ہوتا ہے اور یہی اس غذا کو حل کرکے جزو بدن بنا دیتا ہے۔ یہی اس معدے میں کھانا شروع کرنے سے پہلے ہی جمع ہو جاتا ہے اور اس کے جمع ہونے کی وجہ کھانے کی خوشبو ہوتی ہے۔ خوشبو ناک کے ذریعہ دماغ تک پہنچتی ہے۔ دماغ معدے اور منہ دونوں کو حکم دیتا ہے کہ ہاضمے کا رس تیار کرو۔ اسلئے منہ پانی سے اور معدہ اس رس سے بھر جاتا ہے۔ کبھی یہی کام صرف پلیٹوں کی آواز سننے یا کھانے کا ذکر سننے سے انجام پاتا ہے۔

کوئی سمجھدار انسان یہ مان سکتا ہے کہ اس قدر نازک پر حکمت' پیچیدہ نظام از خود بغیر کسی صاحب حکمت کے وجود میں آسکتا ہے؟

۱۶۔ جب ہمارے اعضاء کام کرتے ہیں تو انہیں شکر کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ کام جگر انجام دیتا ہے۔ جگر شکر بنا کر خون کے ذریعہ سارے

اعضاء تک پہنچاتا ہے۔ ہر عضو کو اتنی ہی شکر دیتا ہے جتنی اسے چاہئے ہوتی ہے۔ گویا جسم بنانے والے کو معلوم تھا کہ اعضاء کو کام کرتے وقت شکر کی ضرورت ہوگی اس لئے اس نے ایک عضو کو یہی کام سپرد کیا۔ وہ بھی اتنا حساس کام کہ وقت ضرورت شکر بنائے اور ہر عضو کو حسب ضرورت پہنچائے۔

اسی طرح جب غذا معدے میں پہنچتی ہے تو اس میں تین رس شامل ہوتے ہیں۔ ۱۔ وہ رس جو معدے کی دیواروں سے نکلتا ہے۔ ۲۔ دوسرے اس جگر سے نکلتا ہے۔۳۔ تیسرا اس بائیں طرف کی ایک گلٹی سے نکلتا ہے۔ اور اگر انسان کو سردی لگ جاتی ہے تو یہی جگر اس جسم کو گرمانے کے لئے اس قدر صفرا خارج کرتا ہے کہ جسم، آنکھیں، چہرہ زرد ہو جاتا ہے۔ غرض یہ تینوں رس ملکر غذا کو ہضم کرتے ہیں۔

پھر غذا ہضم ہونے کے بعد ایک لمبی سی نالی سے ہو کر بڑی آنت میں پہنچتی ہے. اور راستے میں کہیں چربی، کہیں شکر، نشاستہ، کہیں چونا اور دوسرے غذائی اجزاء چھوڑتی جاتی ہے۔ یہ اجزاء اسی نالی کی دیواروں میں جذب ہو کر خون میں چلے جاتے ہیں۔ نشاستہ جسمانی انجن کا کوئلہ ہے۔ لحمیات اس انجن کے خراب پرزوں کی مرمت کرتے ہیں۔

۱۷۔ تمام رگوں کے منہ پر کچھ پٹھے ہوتے ہیں جو بوقت ضرورت رسی کی طرح ان رگوں کا منہ بند کرلیتے ہیں۔ مثلاً ایک لڑکا پڑھ رہا ہے۔ اس وقت اس کے دماغ کو خون کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے اور پیٹ کو کم ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے پیٹ والی رگوں کے منہ بند ہوجاتے ہیں اور خون دماغ کی طرف چلا جاتا ہے۔ یا مثلاً اندھیری رات میں ہم اپنے گھر میں کوئی آہٹ محسوس کرتے ہیں تو فوراً سانس روک کے پھیپھڑوں کا خون دماغ اور کانوں کی طرف بھیجتے ہیں تاکہ آہٹ کی حقیقت معلوم ہوسکے۔

۱۸۔ ہمارا دماغ کھوپڑی کے مضبوط قلعے میں پانی کے اندر تیر رہا ہے۔ پانی کا فائدہ یہ ہے کہ اچھل کود میں دماغ کھوپڑی کی دیواروں سے نہیں ٹکراتا۔ ریڑھ کی ہڈی دماغ سے نکل کر کمر تک جاتی ہے۔ اس سے سینکڑوں رگیں الگ ہوکر جسم میں پھیلی ہوئی ہیں۔ جس طرح ٹیلیفون میں دو تار ہوتے ہیں، ایک پیغام دینے اور دوسرا پیغام لینے کے لئے، اسی طرح جسم کے ہر حصے میں پیغام بھیجنے اور لینے کے الگ الگ تار ہیں۔ مثلاً اگر پاؤں پر کوئی چیونٹی چلی تو فوراً ایک تار سے دماغ کو اطلاع ملتی ہے اور دوسرے دماغ کا ہاتھ کو حکم ملتا ہے۔ اس چھوٹے سے عمل میں تقریباً سات

سوچھے حرکت میں آجاتے ہیں۔ اور ہم چیونٹی کو ہاتھ سے ہٹادیتے ہیں۔

دماغ ہی اعصاب اور اعضاء کو خون لینے یا روکنے کا حکم نافذ کرتا ہے مثلاً کوئی آدمی ہم پر حملہ کرتا ہے تو دماغ مختلف اعضاء کو الگ الگ حکم بھیجتا ہے۔ بھویں تن جاتی ہیں' نتھنے پھول جاتے ہیں' آنکھیں سرخ ہوجاتی ہیں' ہاتھ مکا بن جاتا ہے۔ دل جلدی جلدی حرکت کرنے لگتا ہے تاکہ خون کی مناسب مقدار تمام اعضاء کو پہنچا سکے۔ زخم کی تکلیف دماغ کو پہنچائی جاتی ہے۔ دماغ فوراً علاج کا حکم دیتا ہے۔ خون کا غلیظ مواد جو سفید ذرات پر مشتمل ہوتا ہے زخم پر خون کے ذریعہ پہنچ جاتا ہے۔ یہ ذرات خون کی شریانوں کے منہ پر پھنس جاتے ہیں اور اینٹوں کی طرح انہیں جمانے لگتے ہیں۔ یہاں تک کہ زخم بھر جاتا ہے۔ پھر یہ ذرات باہر کے جراثیم سے باقاعدہ جنگ کرتے ہیں اور زخم سے جو پیپ نکلتی ہے وہ دراصل انہیں ذرات کی لاشیں ہوتی ہیں۔(دو قرآن)

ذرا بتایئے کہ اس قدر پر حکمت' بامقصد' پیچیدہ' منظم' نازک اور مفید نظام از خود بغیر کسی صاحب عقل و ارادہ کے وجود میں آسکتا ہے؟

۱۹۔ ہمارے صرف ہاتھ پاؤں میں ۱۰۶ ہڈیاں ہیں اور صرف انگلیوں میں ۵۸ ہڈیاں ہوتی ہیں۔ پہلے ۵۸ ہڈیاں بنائی گئیں۔ پھر انہیں ایک ترتیب میں

رکھ کر ان کے اندر رگوں پٹھوں کا ایک جال بچھایا گیا۔ پھر ان کے اوپر خوبصورت جلد چڑھادی گئی۔ انصافاً" کہئے کہ اتنا نازک کام از خود ہو سکتا ہے؟ خدا فرماتا ہے۔

"کیا انسان کا خیال ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو دوبارہ جمع کر کے زندہ نہیں کر سکیں گے؟ جبکہ ہم اس کی انگلیوں کے پورے (جیسی نازک چیز تک) تیار کر سکتے ہیں۔" (قیامہ ۳-۴)

غرض جسم انسانی ایک نہایت پیچیدہ حیرتناک مشین جو خدا کی شان تخلیق کو بتا رہا ہے۔

خدا نے فرمایا "خدا نے تمہیں پیدا کیا ہے۔ تمہارے نظام جسمانی میں توازن پیدا کر کے اسے ہر طرح سے مکمل بنا دیا۔ پھر تمہیں ایسی شکل وصورت عطا کی جو اسے پسند تھی۔" (انفطار-۷،۸)

کاربن اور آکسیجن

حیوانات کی زندگی کا دارومدار آکسیجن پر ہے اور نباتات کی زندگی کا دارومدار کاربن پر ہے۔ اگر آکسیجن ختم ہوجائے تو انسان اور حیوان ہلاک ہوجائیں اور اگر کاربن ختم ہوجائے تو نباتات فنا ہوجائیں۔ قدرت نے دونوں کی بقا کا انتظام یہ کیا کہ حیوانات پودوں کے لئے کاربن بناتے ہیں اور نباتات ہمارے لئے آکسیجن بناتے ہیں۔ ہم اور حیوانات ایک سال میں ساٹھ کروڑ کاربن اپنی سانس کے ذریعہ خارج کرتے ہیں اور حیوانات سے ایک سال میں آٹھ کھرب مکعب میٹر آکسیجن استعمال کرتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں کہ خدا نے کس طرح دنیا میں اپنی ربوبیت کا نظام قائم فرمایا ہے۔ زندگی کو قائم رکھنے کا کتنا حیرت انگیز پر حکمت نظام بنایا ہے۔ کیا یہ سب پر حکمت، دقیق پیچیدہ انتظامات از خود وجود میں آسکتے ہیں؟ پھر عالم نباتات میں کتنا تنوع ہے۔ لاکھوں قسم کے پودے ہیں۔ ہر ایک کی شکل صورت خاصیت الگ، پھل الگ، کہیں کوئی غلطی نہیں، بد نظمی نہیں۔ اس کو دیکھ کر انسان کا تخیل کپکپا اٹھتا ہے کہ کس طرح ان سے حسن و جمال بھی پیدا ہوا اور ہماری غذا کا سامان بھی ہوا اور زندگی کی بقاء بھی ہوئی۔

"حسن و جمال پیدا کیا، ہر چیز کو درست بنایا، ہر چیز کو پیدا کرکے اس کو ایک خاص دستورالعمل دیا اور جس نے چراگاہیں اور مرغزار

اگائے"۔(اعلیٰ ۱۔۴)

عجیب بات ہے کہ بادل سمندر سے بنتے ہیں اور سمندر کھاری ہے جبکہ بادل کا پانی میٹھا ہے۔ اربوں' کھربوں ٹن پانی بادل بن کر فضا میں بہہ رہا ہے۔ پھر سمندر کے کھارے پانی اور بادل کے میٹھے پانی کے درمیان ایک پردہ حائل ہے کہ میٹھا پانی کڑوا نہیں ہوجاتا۔ خدا فرماتا ہے۔

"یہ دو سمندر برابر نہیں۔ ایک میٹھا پیاس بجھانے والا ہے جس کا پینا آسان ہے اور دوسرا کھاری اور کڑوا ہے پھر ان دونوں سمندروں سے تم تازہ گوشت بھی حاصل کرتے ہو"۔

پھر یہی برسات کا پانی زمین کے اندر اتر جاتا ہے اور اس طرح ہر قسم کے ہوائی بیکٹریا' جراثیم' ذرات غبارے سے محفوظ ہوجاتے ہیں خدا نے پانی کو زمین کی تہوں میں چھپا کر ہم پر بڑا احسان کیا ہے۔ پھر یہی پانی دریا اور چشموں کی صورت میں ابل پڑتا ہے اور ہمیں سیراب کرتا ہے۔ خدا فرماتا ہے۔

"کیا تم دیکھتے نہیں کہ اللہ نے آسمان سے پانی برسایا اور اب وہ زمین کی رگوں میں چشمے بن کر دوڑ رہا ہے۔ ہم نے ایک معین مقدار میں پانی برسا کر اسے زمین میں محفوظ کردیا ہے اور ہم اس پانی کے ذخیرے کے لے جانے (یعنی) خشک کردینے کی طاقت بھی رکھتے ہیں"۔(مومنون-۱۸)

حکماء جدید کی تحقیق یہ ہے کہ سب سے پہلے کائنات میں دھواں ہی

دھواں تھا۔ اسی دھویں میں برقی ذرات بھی تھے۔ جن سے زمین آسمان ہوا' پانی' سورج تارے بنے اور سورج سے زمین نکلی۔ جب زمین کچھ ٹھنڈی ہوگئی تو اردگرد کا دھواں پانی بن کر زمین پر ٹپک پڑا اور وہی سمندر کہلایا۔ زمین کا اندرونی مواد ابل کر باہر نکل آیا۔ اسطرح پانی گہرائیوں اور پستیوں میں جمع ہوگیا۔ بلندیاں خشک رہ کر زندگی کے لئے تیار ہوگئیں۔ پھر سمندروں سے زندگی کا آغاز ہوا۔ خدا فرماتا ہے۔

"پھر اللہ نے آسمانوں کو پیدا کرنے کا ارادہ کیا جبکہ فضا میں ہر طرف دھواں ہی دھواں تھا۔" (حم سجدہ۔۱۰)

یہ دنیا پھر آخر میں فنا ہوکر دھوان بن کر انہیں برقی ذرات میں تبدیل ہوجائے گی اور پھر ہر طرف دھواں ہی دھواں ہوگا۔ خدا نے فرمایا۔

"اس دن کا انتظار کرو جب فضا میں ہر طرف دھواں ہی دھواں دکھائی دے گا۔ (دخان۔۱۹)

یاد رہے کہ کائنات پر ایک وقت وہ بھی گزر چکا ہے کہ جب ہر طرف پانی ہی پانی تھا خدا نے فرمایا۔

"جب اللہ کی حکومت پانی پر تھی۔" (ہود۔۷)

کائنات کا حسن جمال

کائنات کی تخلیق میں ایک اہم چیز کائنات کا حسن وجمال ہے جو ہر طرف جلوہ آرا ہے۔ کوئی چیز سادہ اور بے رنگ نہیں۔ ہر جگہ دل کو کھینچنے

والی، آنکھوں کو بیدار کرنے والی، کانوں کو کھولنے اولے دلفریب مناظر، بے حجاب جلوے، شیریں نغمے گنگا رہے ہیں۔ پھر انسان کے اندر احساس حسن، طلب حسن کا سمندر موجیں مار رہا ہے۔ کیا کوئی مان سکتا ہے کہ اس قدر رنگا رنگی، اس قدر دلفریبی کے سامان اور پھر خود ہی ہمارے اندر ان کو محسوس کرنے اور داد دینے کا جذبہ از خود پیدا ہو گیا؟ ظاہر ہے کہ دنیا کی بقا ان رنگا رنگیوں کی محتاج نہ تھی۔ ممکن تھا کہ فضا ہوتی مگر نسیم کے جھونکے نہ ہوتے، چڑیاں ہوتیں ان کی چہچہاہٹ نہ ہوتی۔ آسمان ہوتا مگر ستاروں کی بزم آرائیاں نہ ہوتیں۔ سورج ہوتا مگر شفق کی جلوہ نمائیاں اور قوس وقزح کی رنگ رنگینیاں نہ ہوتیں۔ قرآن نے بتایا کہ یہ سب اس لئے ہے کہ انسان کے حس باطن کو بیدار کیا جائے۔ اس میں بصیرت پیدا کر کے خدا کے حسن وجمال کی طرف توجہ مبذول کرائی جائے۔ اسی لئے خدا نے فرمایا۔

"کیا انہوں نے اپنے اوپر آسمان کو نہیں دیکھا کہ ہم نے اس کو کس طرح سجایا؟ اس میں کہیں کوئی رخنہ یا عیب نہیں۔ پھر زمین کو ہم نے بچھایا اور اس میں پہاڑ کاٹ دیئے پھر ان میں ہر قسم کی خوش منظر چیزیں اگائیں۔ ہر متوجہ ہونے والے بندے کی بصیرت اور یاددہانی کے لئے۔" (ق ۵۰، ۶-۸)

"ذرا غور کرو اس آگ پر جس کو تم جلاتے ہو۔ کیا تم نے پیدا کیا

ہے؟ اس درخت کو (جس سے آگ نکلتی ہے) یا اس کے پیدا کرنے والے ہم ہیں، ہم نے اس کو یاددہانی، بصیرت اور صحرا کے مسافروں کے لئے نہایت نفع بخش چیز بنادیا ہے"۔(واقعہ)

آیات کے آخری حصے نے بتایا کہ دنیا کی تمام چیزیں صرف ہماری مادی ضرورت ہی کو پورا نہیں کرتیں بلکہ ان میں حسن اور کمال کی نمود اس لئے رکھی گئی ہے کہ ہم خدا کو پہچانیں یہی اسکا اصلی مقصد ہے۔

"آپ (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) کہہ دیجئے کہ اے انسانو! حقیقت یہ ہے کہ میں تم سب کی طرف اس خدا کا پیغام لایا ہوں جو زمین اور آسمانوں کی حکومت کا مالک ہے۔ اس کے سوا کوئی خدا نہیں۔ وہی زندگی عطا کرتا ہے اور وہی موت دیتا ہے۔ پس تم اس خدا کو بھی دل سے مان لو اور اس کے بھیجے ہوئے نبی امی (یعنی نبیؐ مکی) کو بھی مان لو جو خود بھی اللہ کی باتوں پر یقین رکھتا ہے۔ اس کے پیچھے پیچھے چلو تاکہ تم ہدایت پانے والے ہوجاؤ۔(۱۵۸)(سورہ اعراف ۷ آیت ۱۵۸)

تشریح :

خدا کس کس طرح زندگی عطا کرتا ہے وہ بھی قابل نظر ہے۔ سائنس دانوں نے اندازہ لگایا ہے کہ سمندر کا پانی ہمیشہ نیچے سے اوپر اور اوپر سے نیچے جاتا رہتا ہے۔ گرم پانی اوپر آجاتا ہے اور ٹھنڈا پانی نیچے چلا جاتا ہے۔ اوپر کا پانی ہوا سے آکسیجن لے کر ان حیوانات کو پہنچاتا ہے جو

سمندروں کی تہوں میں رہتے ہیں۔ خدا نے فرمایا۔

"بہت سے ایسے جانور ہیں جو اپنا رزق اٹھائے اٹھائے نہیں پھرتے۔ اللہ ہی ان کو رزق پہنچاتا ہے۔ اور تمہیں بھی رزق پہنچاتا ہے۔"

(عنکبوت ۶۰)

ہمارا رزق سمندروں سے بارش کی شکل میں آتا ہے۔ علماء آبی کا اندازہ ہے کہ ہر سال تمام سمندروں سے چودہ فٹ پانی بادلوں کی صورت میں تبدیل ہوجاتا ہے۔

اسی طرح خدا موت پر بھی قادر ہے۔ کتنے شہر اور پودے' سمندروں' دریاؤں جھیلوں میں اچانک دفن ہوگئے۔ مثلاً کسی زمانے میں ڈنوچ (Dunwich) مشرقی انگلیا کا دارالخلافہ تھا۔ اس میں ۵۲ گرجے اور ۲۳۶ اسکول تھے۔ عروج روما کے وقت یہ شہر روم کی سلطنت میں شامل تھا۔ اڈور دوئم کے زمانے میں اس شہر پر سمندر نے حملہ کردیا کہ سارا شہر اچانک ڈوب گیا۔ اب یہ شہر شمالی سمندر کے ساحل سے بہت دور زیر آب ہے۔

ہالینڈ میں آبی تباہ کاریاں بڑی سبق آموز ہیں۔ یہاں ۱۹۷۷ء میں ایک جھیل ڈالرٹ نمودار ہوئی جس کی وجہ سے سارے کا سارا رقبہ زیر آب آگیا اور اسی (۸۰) ہزار آدمی لقمہ اجل بنے۔ ہالینڈ کے شمال میں ۲۳ بڑے بڑے جزیرے تھے جو چھٹی صدی عیسویں میں خوب آباد تھے۔ اب

ریت کے ڈھیر ہیں۔ انگلینڈ اور امریکہ کے درمیان بعض جگہ ۱۲ سے ۲۱ ہزار فٹ بڑے سمندر ہیں۔ یہ پہلے خشکی تھے۔ ان میں ایک پہاڑ لارا (Laura) تھا۔ اس پہاڑ کا ذکر مصر کی پرانی کتابوں میں ملتا ہے۔ آج یہ حالت ہے کہ پانی کے جہاز اس کی چوٹی کے اوپر سے گزر رہے ہیں۔ اسی طرح ایک دس ہزار فٹ اونچا پہاڑ چوسر (Chaucer) آج چھ ہزار فٹ پانی کے نیچے ڈوبا ہوا ہے۔

آج بھی دنیا کے تمام بڑے بڑے شہر گہرے سمندروں کے کناروں پر آباد ہیں۔ جو ایک معمولی سے زلزلے سے صاف ہوسکتے ہیں۔ کتنی عجیب بات ہے کہ یہ لوگ موت سے اتنے قریب ہونے کے باوجود خدا سے کتنے دور ہیں۔ خدا فرماتا ہے۔

"جب یہ لوگ جہازوں پر سوار ہوکر سمندروں کی موجوں کی لپیٹ میں آجاتے ہیں تو نہایت خلوص سے اللہ کو پکارتے ہیں اور جب ہم انہیں نجات دے کر خشکی پر پہنچادیتے ہیں تو وہ خدا کے ساتھ دوسروں کو شریک کرنے لگتے ہیں"۔ (عنکبوت ۶۵)

پھر فرمایا "ہر قوم کے لئے ایک وقت مقرر ہے۔ جب وہ وقت آجائے گا تو پھر ایک لمحے کی ڈھیل بھی نہیں دی جائے گی"۔

مقصد تخلیق

قرآن میں انسان کے مقصد تخلیق کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ

انسان کو چاہئے کہ (۱) خدا کو دل سے مانے اور (۲) اس کے احکامات کی اطاعت کرے۔ اس کائنات میں انسان جو ایک مختار نما مخلوق ہے' اس کا تکامل یہی ہے کہ وہ اپنے اختیارات کو بجائے اپنی خواہشات کے زیر نگیں کرنے کے اپنے اختیارات کو خدا کے بھیجے ہوئے قانون کے تحت کر دے۔ اس طرح وہ خدا کا خلیفہ بن کر دنیا میں رہے گا۔ اس لئے کہ وہ جتنا خدا کی امانت اختیار کو خدا کی مرضی کے مطابق استعمال کرتا ہوگا' اتنا ہی اس کی خلافت عبدیت کا روپ اختیار کر لے گی۔ یہی اس کی آزمائش کی کامیابی ہوگی۔ اس عبدیت اور اطاعت سے ہٹ کر انسان پھر کسی مقام پر ٹھہر کر اپنی ہستی کو کارآمد اور نظام کائنات کا مفید جزو ثابت نہیں کر سکتا کیونکہ اس کے اختیار کی قدرتی مجبوریاں اور اس کے ناقص علم کا تقاضا یہی ہے کہ وہ خود کو خدا کے کامل علم اور کامل اختیار کے تابع کر دے۔ یہی خدا کی اطاعت' ناقص کا رشتہ کامل سے جوڑ دیتی ہے' جو ناقص کی کامیابی کی قطعی ضمانت بھی ہے اور اس کی غرض تخلیق بھی۔

مومن تو فقط حکم الٰہی کا ہے پابند
تقدیر کے پابند نباتات و جمادات

خدا نے فرمایا۔ "کیا انہوں نے آسمانوں اور زمین کے انتظامات اور کارخانہ قدرت پر' اور ہر اس چیز پر جسے خدا نے پیدا کیا ہے' کبھی غور ہی نہیں کیا؟ اور کیا انہوں نے کبھی بھی نہیں سوچا کہ ان کی موت اب بالکل

قریب آگئی ہے؟ تو اب اس کے بعد آخر وہ کس بات کو مانیں گے؟ (۱۸۵)غرض جسے خدا گمراہی میں چھوڑ دے (معلوم ہوا کہ کائنات کے انتظامات پر غور نہ کرنے والوں کو خدا گمراہی میں چھوڑدیا کرتا ہے) اس کے لئے پھر کوئی سیدھا راستہ دکھانے والا نہیں ہوتا۔ پھر خدا انہیں ان کی سرکشی میں (دل کا) اندھا بنے بھٹکتا ہوا چھوڑ دیا کرتا ہے"۔(۱۸۶)(سورۂ اعراف ۷' آیت ۱۸۶'۱۸۵)

تشریح :

حضرت امام علی رضا علیہ السلام سے روایت ہے کہ جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا۔ "عبادت یہ نہیں ہے کہ کثرت کے ساتھ رکوع اور سجدے کئے جائیں' بلکہ عبادت یہ ہے کہ خدا کے کاموں' دلیلوں اور نشانیوں پر غور وفکر کیا جائے"۔(اصول کافی)

حضرت امام جعفرصادق علیہ السلام سے روایت ہے جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا کہ "ایک گھنٹہ غور وفکر کرنا ستر سال عبادت کرنے سے بہتر ہے"۔(اصول کافی)

فطرت انسانی کا تقاضا

خود بخود ہونے والی ہستی کا ماننا فطرت اور عقل کی ضرورت ہے

انسان کی عقل اور فطرت مجبور کرتی ہے کہ ہم کسی خود بخود ہونے

والی ہستی' دائمی ہستی کا اقرار کریں۔ مادہ پرست خدا کے منکر بھی یہی کہتے ہیں کہ مادہ خود بخود موجود ہونے والی چیز ہے' جس سے تمام کائنات بنی ہے۔ گویا خدا کے منکر مادیین کو بھی ماننا پڑا کہ ایک چیز ہے جو خود بخود ہے اور سب کی خالق ہے۔ اب ان منکروں نے اس چیز کا نام مادہ رکھا۔ دیکھو خدا کا جنھوں نے انکار کیا تھا' انہوں نے بھی پلٹ کر خود بخود ہونے والی چیز کا اقرار کیا۔ فطرت انسانی کی یہی مجبوری ہے کہ مادہ پرست اور خدا پرست دونوں ایک خود بخود ہونے والی ہستی کو ماننے پر مجبور ہیں۔ مادہ پرست خدا کا انکار کر کے اس خود بخود ہونے والی چیز کا اقرار کرتا ہے' جس کا نام وہ مادہ رکھتا ہے۔ گویا دونوں خدا کے ماننے والوں اور نہ ماننے والوں میں صرف لفظ پر جھگڑا ہے کہ اس خود بخود ہونے والی ہستی کا نام "خدا" رکھیں یا "مادہ" رکھیں۔ غرض حقیقی اختلاف' صفات پر ہے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم کے مطابق وہ خود بخود ہونے والی ہستی غیر محدود کمالات اور برکات کا سرچشمہ ہے جس کی جلوہ فرمائیاں محدود پیمانے پر کائنات بھر میں دکھائی دیتی ہیں۔ مادہ پرستوں نے سمجھا کہ نظام کائنات میں جن اوصاف و کمالات کا مظاہرہ ہو رہا ہے' ان کا سرچشمہ مادہ ہے۔ جو ہر کمال سے عاری ہے۔

یہ اس لئے ہے کہ فطرت انسانی میں قطعا" ایسی بات کی گنجائش ہی موجود نہیں ہے کہ وہ نیستی محض سے ہستی کے نکلنے کا تصور کر سکے۔ اس

لئے یہ سوچ کہ ایک زمانہ تھا جب وہ نہ تھا' پھر یکایک ہوگیا' تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ نیستی محض سے وجود پیدا ہوگیا۔ اور اس بات کو کوئی عقل سوچنے کو تیار نہیں ہو سکتی۔ اسی لئے قرآن نے ہم کو یہ بتایا کہ خدا ہمیشہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ ہمیشہ رہے گا۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ ہستی ہستی سے نکلی اور وہ ہستی جس سے سب کچھ نکلا ہمیشہ سے ہے' اور ہمیشہ رہے گی۔

فلسفہ اور وجود خدا

فلسفہ کے چار اسکول ہیں جس میں سے دو خدا کو مانتے ہیں جبکہ ایک خدا کے ہونے نہ ہونے پر شک کرتا ہے۔ ایک اسکول خدا کا انکار کرتا ہے۔

۱۔ ثنویت

فلسفہ کا پہلا اسکول ثنویت کا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ صفات یا اوتار کے دو مظہر ہیں۔ (۱) حیاتی (۲) غیر حیاتی۔ کیونکہ یہ دونوں ایک دوسرے سے بالکل جدا ہیں۔ (۱) روح یا خدا جو حیات مطلق ہے اور عالم کے سارے حیاتی صفات مثلاً ادراک' علم ارادی کا مرجع ہے۔ (۲) دوسرے مادہ جو کائنات کے تمام غیر حیاتی اشیاء کا مصدر اور سرچشمہ ہے۔

اس فلسفے کی ابتدا ارسطو نے کی اور متاثرین میں ڈیکارٹ اور فلسفیوں کا بہت بڑا گروہ اس خیال کو مانتا ہے۔

۲۔ تصوریہ

ان کے نزدیک مادہ ایک بے معنی چیز ہے۔ صرف روح یا خدا اور اس کے جلوے ہیں جو ہر طرف دکھائی دیتے ہیں۔ اس خیال کی ابتدا افلاطون سے ہوئی اور آج بھی تمام سربر آوردہ فلاسفر افلاطون سے لے کر برگسان تک اس خیال کی تائید پر مصر ہیں۔ گویا وہ خدا کا اقرار اتنا زبردست طریقے سے کرتے ہیں کہ خدا کے سوا کسی دوسری چیز کو ماننے کے لئے بھی تیار نہیں ہیں۔

۳۔ ارتیابیت

ان بیچاروں نے فلسفہ کی ہنگامہ آرائیوں کو دیکھ کر اپنی پناہ گاہ اعتراف جہل میں بنائی۔ یہ کہتے ہیں کہ ہمیں کچھ معلوم نہیں کہ اس عالم محسوس کا اصلی سرچشمہ کیا ہے۔ مادہ ہے یا خدا ہے؟ کیونکہ یہ باتیں ہماری سرحد ادراک سے باہر ہیں اور عقل ان کو نہیں سمجھ سکتی' اس لئے اس پر بحث کرنا فضول ہے۔ اگرچہ یہ قدیم مسلک ہے مگر یورپ میں ہوم اسپنسر اور ہکسلے وغیرہ اس کو مانتے ہیں۔

۴۔ مادیت

ان کے نزدیک جس طرح غیرحیاتی صفات کا سرچشمہ ارسطو کے نزدیک مادہ ہے اسی طرح حیاتی صفات بھی دراصل مادہ ہی کی ایک شان ہے۔ مادہ

اپنی ابتدائی حالت میں صرف طول' عرض' نرمی' سختی وغیرہ کی صفات سے موصوف تھا لیکن رفتہ رفتہ اس میں ترقی ہوتی رہی اور نئے صفات کا اضافہ ہوتا رہا۔ پہلے اس میں نشوونما کی صفت پیدا ہوئی اور پھر ترقی کرتے کرتے اس میں ذہن تخیل ارادہ تعقل کی صفات بھی پیدا ہوگئے۔ غرض یہ سارے صفات مادے ہی کے ہیں۔ حیات زندگی روح جو کچھ ہیں وہ صرف مادہ ہے اور مادہ کی مختلف نیرنگیاں ہیں۔

اس خیال کی بنیاد تین ہزار سال پہلے دمقراطیس نے رکھی اور پھر یورپ میں بھی اس مسلک کو مانا جاتا ہے۔ فلسفہ میں صرف یہی ایک مسلک ہے جو مذہب کا مخالف ہے۔ کیونکہ یہ خدا کے بجائے مادہ کو کائنات کا سرچشمہ سمجھتا ہے۔ ان کے نزدیک مادہ ہی مادر کائنات ہے جو خود اپنے رحم سے کائنات کو برآمد کرتی رہتی ہے۔ اب مادہ کی حقیقت کیا ہے؟

تو مادہ کی تعریف ارسطو کے نزدیک تو یہ تھی کہ وہ نہ ایک ہے' نہ چند' نہ واحد ہے نہ کثیر غرض اس میں کوئی ایجابی صفت نہیں پائی جاتی۔ گویا وہ کچھ نہیں' لاشے ہے۔

دمقراطیس کہتا ہے کہ مادہ سالمات اور چھوٹے چھوٹے ذرات کا مجموعہ ہے۔ اب موجودہ سائنس دان کہتے ہیں کہ مادہ انرجی ہے اور برق پاروں سے مرکب ہے اور ایتھر کے سمندروں میں تیرتا پھرتا ہے۔ گویا یہ ساری کائنات انرجی کی نیرنگیوں کا تماشا ہے۔ آپ نے دیکھا جس اینٹ پر

اس فلسفہ کی ساری عمارت کھڑی کی گئی تھی وہ مادہ تھا جس کو تحقیق نے ثابت کردیا کہ وہ بجز ایک خود تراشیدہ وہم کے کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ اب مادیین کے پاس کیا رکھا ہے جس پر وہ اپنا قدم جما سکیں۔ بقول شاعر

پر وہی گر پڑا کبوتر کا
جس میں نامہ بندھا تا دلبر کا

ذرا صفات کو الگ کرنے کے بعد بتاؤ کہ مادہ کیا چیز ہے؟ جس چیز کا نام تم نے مادہ رکھا ہے تو جو چیز بھی بتاؤ گے وہ صفت ہوگی۔ اور جو صفت نہیں ہے اسکو کوئی نہیں بتا سکتا کیونکہ حواس کا علم صرف صفات تک محدود ہے اور حواس کے سوا ہمارے پاس صحیح علم کا کوئی دوسرا ذریعہ ہی نہیں ہے۔

مثلاً نارنگی میں کچھ صفات ہیں۔ اب اگر ان صفات کو ایک ایک کرکے نارنگی سے نکال لیا جائے تو پھر اس کے اندر کیا رہ گیا جس کا نام مادہ رکھا جائے؟ رہے یہ صفات تو وہ صرف ہمارے احساسات ہیں۔ تو پھر ذہن کے سوا ان کے لئے کسی اور محل کے تلاش کرنے کی ضرورت کیا ہے؟ (الدین القیم)

جدید سائنس اور خدا کا وجود

جدید سائنس کے اعلیٰ مفکرین اس تصور کو نہیں مانتے۔ ملین ایڈورڈ کہتا ہے۔

"عالم کے ان قوانین کے بارے میں یہ کہنا کہ یہ محض اتفاق کے نتائج ہیں۔ یہ فرضی احتمالات اور عقلی گمراہیاں ہیں جسے لوگوں نے محسوسات کا لقب دے رکھا ہے۔ فزیکل سائنس جاننے والا ہرگز اس قسم کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔"

نیوٹن نے کہا۔

"عالم فطرت کی نیرنگیاں واجب الوجود (خدا) کے ارادہ کے سوا اور کسی چیز سے ظاہر نہیں ہو سکتیں۔ وہ واجب الوجود ہر جگہ اور ہمیشہ موجود ہے۔"

پروفیسر ٹنڈل نے لکھا۔

"جس طرح گھڑی کی سوئیوں کے چلنے کا سبب انسانی تخلیق کا کمال ہے یہی حال واقعات وحوادث کا ہے۔ عالم کی اس مشین کے اندر بھی ایک مخفی مشین کارفرما ہے۔ اور ایک قوت کا زبردست خزانہ ہے جو کائنات کی اس مشین کو چلا رہا ہے۔ سائنس کا انتہائی کام اس مشین اور ذخیرۂ قوت سے پردہ ہٹا کر یہ بتاتا ہے کہ واقعات اور حوادث ان ہی دونوں کے باہمی تعلق کا نتیجہ ہے لیکن یہ سوال کہ کارخانہ عالم کی یہ اندرونی مشین خود کیا ہے؟ اور کیسے بنی؟ اس گھڑی میں کس نے چابی بھری؟ اس کو چلانے والی قوت کہاں سے آئی؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کا جواب سائنس کے بس سے باہر ہے۔"

یعنی سائنس بس اتنا بتا سکتی ہے کہ کوئی قوت تو ضرور ہے جو اس نظام کائنات کو چلا رہی ہے۔ مگر اس کی صفات اور مقاصد کا بتانا سائنس کے بس کی بات نہیں۔ یہ کام وحی کا ہے۔ پیغمبروں اور آسمانی کتابوں کا ہے۔ غرض ہمارے سامنے کچھ قدرتی قوانین پھیلے ہوئے ہیں۔ ہم ان قوانین کو بنا نہیں سکتے۔ صرف جان سکتے ہیں۔ رہا یہ سوال کہ ان قوانین کا بنانے والا کون ہے؟ اور ان کا آخری انجام کیا ہوگا؟ سائنس کے حدود سے اس کا جواب خارج ہے۔

ہکسلے نے لکھا۔

"سائنس کسی چیز کی بھی کامل توجیہہ نہیں کر سکتی۔ کسی چیز کے سارے اسباب اول سے آخر تک نہیں بتائے جا سکتے۔ کیونکہ انسان کا اعلیٰ سے اعلیٰ علم بھی آغاز اشیاء کے بارے میں چند قدم سے آگے نہیں بڑھ سکتا"۔

غرض سائنس زیادہ سے زیادہ ہمیں خدا کے موجود ہونے اور اس کی چند صفات کو تو بتا سکتی ہے، اس کے آگے خدا کے مقاصد کو سمجھنا سائنس کے بس کی بات نہیں۔ یہ علم آسمانی کتابوں، پیغمبروں اور خدا کی ہدایات ہی سے ممکن ہے۔

خدا کا دیدار

خدا کا فرمانا کہ "کیا انہوں نے کبھی یہ بھی نہیں سوچا کہ ان کی موت

اب بالکل قریب آگئی ہے؟ تو آخر اس کے بعد وہ کس بات کو مانیں گے؟"

اس سے معلوم ہوا کہ انسان موت اور مصیبت کے وقت خدا کو ماننے پر مجبور ہوتا ہے۔ اس لئے ان دونوں اوقات میں غفلت کے پردے ہٹنے لگتے ہیں۔ مال' اولاد' جان وعزت کا نشہ اترنے لگتا ہے۔ اس لئے حقائق دکھائی دینے لگتے ہیں۔

سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیاء نے لکھا کہ ایک شخص حضرت امام جعفرصادق علیہ السلام کے پاس آیا اور کہا کہ اللہ کو مجھے دکھلاؤ۔ آپ نے پہلے تو اسے سمجھایا کہ تم نے موسیٰؑ اور ان کی قوم کا حشر نہیں دیکھا۔ اس نے کہا وہ موسیٰؑ کی قوم تھی اور یہ زمانہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہے۔ حضرت امام صادقؑ نے اپنے غلاموں سے کہا۔ اسے پکڑ کر پانی میں غوطے دو۔ وہ فریاد کرتا رہا کہ فرزند رسولؐ مجھے بچایئے۔ آپ غلاموں سے فرماتے رہے کہ اسے غوطے دیتے رہو۔ آخر جب اس نے الٰہی الغیاث اے خدا فریاد! کہا تو امام نے اپنے خادموں سے فرمایا کہ اسے چھوڑ دو۔ اس نے امامؑ کے قدموں پر سر کو رکھ دیا اور کہا کہ "میں نے دیکھ لیا" جب آپ نے میری فریاد نہ سنی تو میں نے سوچا کہ اب مجھے خدا سے فریاد کرنی چاہئے۔اس وقت ایک سوراخ میرے دل میں پیدا ہوا میں نے اس میں وہ دیکھا جسے میں دیکھنا چاہتا تھا۔

خدا کی یکتائی

قرآن میں خدا نے خود کو نور فرمایا ہے۔ نور کی تعریف یہ ہے کہ "الظاہر بذاتہ المظہر لغیرہ" جو خود بھی ظاہر ہو اور دوسری چیزوں کو بھی ظاہر کرے۔ خدا "زمین و آسمان کا نور ہے" یعنی خدا کا وجود خود بھی متحقق ہے۔ واقعیت رکھتا ہے اور دوسری چیزیں بھی خدا کی وجہ سے واقعیت اور تحقق پیدا کرتی ہیں۔ اب اگر ایک غیر متناہی نور فرض کیا جائے گا تو وہ دو نہیں ہوسکتے۔ کیونکہ فانوس کی روشنی کتنی ہی تیز کیوں نہ ہو' بہرحال محدود ہوگی۔ دوسری جانب اندھیرا ہوگا۔ لیکن لامحدود نور حدود میں گھرا ہوا نہ ہوگا۔ اس لئے دو نہیں ہوسکتے کیونکہ اگر دو فرض کرلیا جائے تو وہ محدود ہوگا۔ وہ اس طرح کہ دو میں ایک تو دوسرے نور کی خصوصیت کا حامل نہیں ہوگا۔ اس میں اس کا کمال اور اس میں اس کا کمال نہیں پایا جاتا۔ اس طرح دونوں محدود ہوں گے۔ جبکہ ہم نے فرض کیا ہے کہ نور غیر متناہی ہے اور اس کی کوئی حد نہیں ہے۔ اس لئے لازمی طور پر جو نور غیر متناہی ہوگا وہ ایک ہی ہوگا۔ اس میں دوئی نہ ہوگی۔

خدا کے جلوے

فلسفیوں کے قول کے مطابق عالم ملائکہ' عالم عقول ہے۔ یہ وہ عالم ہے جہاں خدا کے جلوے بہت شدید ہیں۔ گویا وہ عالم قریب ہے۔ یہی جلوے جب عالم مادہ یا ہمارے عالم ناسوت تک پہنچتے ہیں تو گھٹتے چلے جاتے ہیں۔ کیونکہ ہمارا عالم پست ترین مرتبہ پر ہے۔ فلاسفر اسے ادنیٰ ترین عالم

وجود کہتے ہیں۔ مگر خدا کے یہ تمام جلوے خدا کی ذات سے الگ کوئی مستقل وجود نہیں رکھتے۔ ان کی خدا کے مقابل کوئی حیثیت نہیں۔ جس طرح دن میں کمرے کے اندر نور اصل میں باہر کی روشنی کا صرف پرتو ہوتا ہے۔ اس کی الگ اپنی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ اس طرح ساری کائنات کی بھی کوئی مستقل حیثیت نہیں۔ ساری موجودات خدا سے وابستہ ہیں۔ خدا مستقل قائم بالذات اور قیوم بالذات ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہم خدا کے موجود ہونے کو تو سمجھ سکتے ہیں لیکن اس کی ذات کی حقیقت کو نہیں سمجھ سکتے۔ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ "جس نے خدا کے لئے کوئی مثل فرض کیا اس نے خدا کی غیر متناہی حقیقت کو درک نہیں کیا کیونکہ خدا ایسی لامتناہی حقیقت ہے جو اپنی ضد سے مرکب نہیں۔ ایسی حقیقت صرف ایک ہی ہوسکتی ہے دو نہیں۔ لہٰذا جس نے خدا کے لئے کوئی مثل فرض کیا اس نے خدا کی غیر متناہی حقیقت کو نہ سمجھا"۔ اسی لئے حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا۔ "جو خدا کے لئے تشبیہ کا قائل ہوا اس نے خدا کا قصد ہی نہیں کیا۔" اس لئے کہ اگر اس کی شبیہہ فرض کی گئی تو وہ دو ہوجائے گا۔ اور دو ہوجانے کے بعد محدود ہوجائے گا۔ اور خدا لامحدود ہستی کا نام ہے جس میں دوئی کا تصور ہی موجود نہ ہو۔ خدا کی ہستی بھی غیر متناہی ہے اسی طرح اس کا علم قدرت حیات سب غیر متناہی ہیں۔ اسی لئے حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا۔ "جو خدا کو اپنے تصور کا پابند

بنائے یا اس کی طرف اشارہ کرے' اس نے خدا کا رخ نہیں کیا"۔

پھر اشارہ کی بھی دو قسمیں ہیں۔ (۱) اشارۂ حسی۔ یعنی ہاتھ یا جسم کے کسی حصے کی طرف اشارہ کیا جائے۔ (۲) اشارہ توہمی۔ دماغ میں جب کسی چیز کو جگہ دی جائے۔ خدا کی طرف ہم نہ تو انگلی سے اشارہ کر سکتے ہیں اور نہ ذہن میں اس کو جگہ دے سکتے ہیں۔ اس لئے خدا کا وجود لامحدود ہے۔ اور ہمارا ذہن محدود ہے اور محدود چیز لامحدود کا احاطہ نہیں کر سکتی۔ جیسے دریا کوزے میں سما نہیں سکتا۔

ذہن میں جو چیز بھی آئے گی وہ خود ہمارے ذہن کی پیداوار ہوگی اس لئے مخلوق ہوگی اور خالق مخلوق نہیں ہو سکتا۔ اس لئے نتیجہ یہ نکلا کہ ہم خدا کو صرف اور صرف "صفات سلبیہ" کے ذریعہ پہچان سکتے ہیں۔ اس لئے کہ صفات اضافیہ میں اضافت کا دوسرا سرا تو ہم خود ہیں اس لئے صفات سلبیہ کے ذریعہ ہم اس کی گواہی دے سکتے ہیں۔ مثلاً ہم محدود جسم ہیں اور خدا لامحدود ہے۔ اس لئے ہم خدا کے جسم کی نفی کرتے ہیں یا مثلاً ہمارا دماغ محدود ہے اور خدا لامحدود ہے اس لئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جو کچھ بھی خدا کے بارے میں دماغ میں آتا ہے وہ خدا نہیں ہے۔ اس لئے امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت ہے کہ جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

"جو چیز تمہارے دماغ میں آتی ہے' وہ چاہے کتنی ہی گہری اور معنی

غیز کیوں نہ ہو' وہ بہرحال تمہارے ذہن کی پیداوار ہے۔ اس لئے شاید چیونٹی بھی یہ سمجھتی ہوگی کہ خدا کے (معاذاللہ) دو سینگ ہیں۔"

کیونکہ چیونٹی سینگوں کو اپنا جمال اور کملا سمجھتی ہوگی اس لئے حضرت موسیٰؑ کے زمانے کا ایک چرواہا یہ سمجھا کہ جو چیزیں بکریاں شوق سے کھاتی ہیں' خدا بھی (معاذاللہ) ان چیزوں کو ذوق وشوق سے کھائے گا۔ یا ہاتھ پیر دبانے سے شاید اس کو بھی لطف آتا ہوگا۔ اس لئے اس نے خدا سے یہ دعا کی کہ تو کہاں ہے؟ مجھے بتا تاکہ میں تیری خدمت کروں۔ تیرے سر میں کنگھی کروں' تیرے ہاتھ پیر چوموں اور تیرے پیر دباؤں اور تیرے سونے کے لئے نرم بچھونا بچھاؤں وغیرہ وغیرہ۔ (رسالہ توحید آقائے مطہری شمارہ نومبر۱۹۸۶ء)

یہ ساری غلطیاں اسی لئے ہوتی ہیں کہ ہم خدا کے بارے میں اپنی عقل سے سوچ کر ایک تصور قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جبکہ امام علی نقی علیہ السلام نے توحید کے بارے میں یہ اصول ہمیں دیا ہے کہ "ان اللہ لایوصف الا بماوصف بہ نفسہ" یعنی خدا کے بارے میں ہم کچھ بیان نہیں کرسکتے سوا اس کے کہ جو اس نے خود بیان فرمایا ہے۔ اس لئے کہ ہم اس کو کیسے بیان کرسکتے ہیں جس کو ہمارے حواس پا ہی نہیں سکتے۔ (تحف العقول)

قرآن (سورہ یونس)

"وہی خدا ہے جس نے سورج کو چمکدار بنایا اور چاند کو روشن کیا۔ اور چاند کے گھٹنے بڑھنے کی مختلف منزلیں بالکل ٹھیک ٹھیک مقرر کیں۔ تاکہ تمہیں اس سے برسوں کا شمار اور تاریخوں کا حساب معلوم ہو۔ اللہ نے یہی سب کچھ بالکل صحیح، ٹھیک ٹھیک اور بامقصد بنایا ہے۔ (اس طرح سے) وہ اپنی نشانیاں اور دلیلیں کھول کھول کر تفصیل کے ساتھ پیش کررہا ہے، ان لوگوں کے لئے جو جاننا چاہیں۔-(۵) غرض یہ حقیقت ہے کہ رات اور دن کے الٹ پھیر اور آنے جانے میں، اور ہر اس چیز میں جو اللہ نے زمین اور آسمانوں میں پیدا کی ہے۔ (خدا کی قدرت حکمت اور عظمت کی بے شمار) دلیلیں اور نشانیاں موجود ہیں، ان لوگوں کے لئے جو برائیوں اور برے انجام سے بچنا چاہیں۔ (یا) ان لوگوں کے لئے جو اپنے لئے فکر نجات رکھتے ہیں۔-(۶) اصل بات یہ ہے کہ جو لوگ ہم سے ملنے کی امید ہی نہیں رکھتے (کیونکہ) وہ دنیا ہی کی زندگی پر خوش اور مطمئن ہیں۔- (اسلئے) وہ ہماری باتوں، دلیلوں اور نشانیوں سے غافل ہیں۔-(۷) ان کا اصل ٹھکانہ جہنم ہے۔ ان کاموں یا کمائی کی سزا

میں جو وہ کیا کرتے تھے۔(۸) اور یہ بھی حقیقت ہے کہ جن لوگوں نے خدا اور ابدی حقیقتوں اور صداقتوں کو دل سے مانا اور (اس کے نتیجے میں) اچھے اچھے کام بھی کرتے رہے' انہیں ان کا پالنے والا مالک ان کے خدا کو دل سے ماننے کی وجہ سے سیدھے راستے پر چلا کر منزل مقصود (یعنی جنت اور خدا کی رضامندی) تک پہنچا دے گا۔ ان کے قدموں کے نیچے نعمت بھرے سرسبز شاداب اور گھنے باغوں میں نہریں بہہ رہی ہوں گی"۔(۹)(سورۂ یونس آیت ۵-۹)

تشریح:

"ضیاء" یعنی چمکدار اس روشنی کو کہتے ہیں جو ذاتی اور مستقل حیثیت رکھتی ہو جو سورج کے لئے بیان کی گئی ہے اور نور اس روشنی کو کہتے ہیں جو ضیاء سے لی گئی ہو یا ضیاء کا انعکاس ہو۔ قرآن نے تیرہ سو سال پہلے ایک امی کی زبان کے ذریعے بتا دیا تھا کہ چاند بذات خود بے نور ہے۔ اور اس کی تمام چمک دمک سورج کا عکس ہے۔

اور خدا کا یہ فرمانا کہ "اللہ نے یہ تمام چیزیں بے مقصد نہیں بنائیں" وہ بتاتا ہے کہ لاکھوں فوائد کے ساتھ ساتھ سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ انسان کائنات کے قوانین کی یک رنگی اور اس کے نظم وضبط کو دیکھ کر یہ سمجھ لے کہ یہ سب کچھ اس کے خالق کی عظمت' قدرت اور حکمت کی

نشانیاں یا دلیلیں ہیں۔

کوئی معشوق ہے اس پردۂ رنگاری میں

ویسے تو یہ تمام دلائل ساری مخلوقات کے لئے ہیں مگر ان کو سوچنے سمجھنے اور فائدہ اٹھانے والے صرف اور صرف وہی لوگ ہوں گے جو طالب حق ہوں گے اور عملاً "فرائض الیہ کو ادا کرتے ہوئے برائیوں سے بچنے والے ہوں گے۔

نیز تقویٰ کے معنی امکانی خطرات سے اپنا بچاؤ کرنا ہوتے ہیں۔ اور یہی عقل کا تقاضا بھی ہے کہ انسان فکر و نظر سے کام لے کر خدا کو مانے اور اس کے ماننے کے تقاضوں کے مطابق عمل کرے۔ (جلالین)

محققین نے نتیجے نکالے۔ (۱) انسان کی تباہی اور بربادی کا اصل سبب دنیا کی مادی لذتوں اور نعمتوں پر مطمئن ہوجانا ہوتا ہے۔ بقول اقبال۔

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کرگیا
ورنہ گلشن میں علاج تنگی داماں بھی تھا

(۲) اور انسان دنیا کی نعمتوں پر اس لئے مطمئن ہوجاتا ہے کہ آخرت کا تصور اس پر واضح نہیں ہوتا۔ وہ سب کچھ دنیا ہی کو سمجھ لیتا ہے۔ اس تنگ نقطہ نظر کی وجہ سے اس کی دنیا اور آخرت دونوں تباہ ہوجاتے ہیں۔ فکر آخرت نہ ہونے کی وجہ سے وہ جو چاہتا ہے کر گزرتا ہے۔ (۳) معلوم ہوا کہ انسان کی اصل دولت اور اصل سرمایہ اس کے اعمال ہیں۔ مال

کرسی اولاد اس کی اصل دولت نہیں۔ (۴)اور یہ کہ انسان کے اعمال اسکے افکار، خیالات اور نظریات کا منطقی نتیجہ ہوتے ہیں۔

آخرت کے وجود کے دلائل

۱۔ کائنات کی اس قدر پیچیدہ اور حکیمانہ تخلیق گواہی دے رہی ہے کہ اس کا خالق کوئی بچہ نہیں ہوسکتا۔ جس نے محض کھیل کود کے لئے یہ ساری کائنات بنائی اور پھر دل بھرنے کے بعد یونہی اس گھروندے کو توڑ پھوڑ ڈالے گا۔ صاف دکھائی دے رہا ہے کہ ہر کام میں بلا کا نظم وارتباط ہے، حکمتیں ہیں، مصلحتیں ہیں، ذرہ ذرہ کی پیدائش تک میں گہری مقصدیت ہے، تو ایسے حکیم کے لئے کیسے ممکن ہے کہ وہ انسان کو آزادی اور اختیار دے کر اس کی زندگی کا حساب نہ لے؟

۲۔ جب پہلی زندگی کا پیدا ہونا ممکن ہے، تو دوسری زندگی کے پیدا ہونے کا امکان ثابت ہوگیا۔

۳۔ دوسری زندگی کی ضرورت ہے کیونکہ دنیا کی پہلی زندگی میں انسان اپنی اخلاقی ذمہ داری کو صحیح یا غلط جس طرح بھی ادا کرتا ہے اس سے سزا یا جزا کا استحقاق پیدا ہوتا ہے۔ اس بناء پر عقل وانصاف کا تقاضا ہے کہ ایک اور زندگی ہو، جس میں ہر شخص اپنے اخلاقی رویہ کا وہ نتیجہ دیکھے جس کا وہ مستحق ہے۔

غرض اللہ نے نہایت حکیمانہ طریقے سے زندگی کے مظاہر میں ہر

طرف وہ آثار پھیلا رکھے ہیں جو اس کی قدرت اور حکمت کی طرف واضح اشارے کر رہے ہیں۔ مگر ان نشانات سے حقیقت تک صرف وہ لوگ پہنچ سکتے ہیں جن میں دو صفات ہوں۔ ایک یہ کہ وہ جاہلانہ تعصبات سے پاک ہو کر علم حاصل کریں اور دوسرے یہ کہ ان کے اندر یہ خواہش موجود ہو کہ وہ فکری اور عملی غلطیوں سے بچیں گے اور صحیح راستہ اختیار کریں گے۔ (تفہیم)

اللہ نے جو کچھ زمین اور آسمانوں میں پیدا کیا ہے' وہ سب خدا کے وجود' قدرت' عظمت' حکمت اور رحمت کی دلیلیں اور نشانیاں ہیں۔

موجودہ سائنس دانوں کی تحقیق یہ ہے کہ کائنات میں کم سے کم تیس کروڑ زمینیں چکر کاٹ رہی ہیں اور تقریباً دس کروڑ سورج فضا میں تیر رہے ہیں ہر سورج کے گرد کم سے کم تین زمینیں گھوم رہی ہیں۔ خدا نے فرمایا۔

"اللہ کے لشکروں کا علم صرف اللہ ہی کو ہے۔" (مدثر ۳)

ایک مغربی مفکر لکھتا ہے۔

"حیرت ہے کہ ایک طرف تو انسانی عقل قدرت کی بڑی بڑی عظیم الشان ایجادات کو دیکھ کر لرز اٹھتی ہے اور دوسری طرف باریک ترین ذرات کا اعجاز دیکھ کر حیرت میں کھو جاتا ہے۔"

خدا فرماتا ہے "زمین اور آسمان کا کوئی ذرہ (جوہر) سے بھی چھوٹا

(منفیہ) یا بڑا (سالمہ) اللہ کی نگاہ سے غائب نہیں بلکہ اس کی روشن کتاب میں موجود ہے۔" (یونس-۶۱)

نیز خدا نے فرمایا "اللہ زمین اور آسمانوں کی لگامیں تھامے ہوئے ہے کہ کہیں یہ اپنے مداروں کو چھوڑ کر بھاگ نہ جائیں اور اگر ایسا ہو جائے تو اس کے بعد کوئی نہیں جو ان کو تھام سکے۔ اللہ نے آسمانوں (مراد ستاروں اور سیاروں) کو تھام رکھا ہے کہ کہیں زمین پر گر نہ پڑیں۔" (حج-۶۵)

غرض کائنات کی ان تخلیقات پر غور کرنا ہی خدا کی معرفت حاصل کرنے، اس کی عظمت، حکمت اور قدرت کو سمجھنے کا واحد ذریعہ ہے اس لئے ان پر تفکر اور تدبر سب سے بڑی عبادت ہے۔ حضرت امام رضا علیہ السلام سے روایت ہے کہ جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ "عبادت یہ نہیں کہ کثرت سے نماز میں کھڑا رہا جائے اور کثرت سے سجدے کئے جائیں بلکہ عبادت یہ ہے کہ خدا کے کاموں، تخلیقات پر غور و فکر کیا جائے۔" (الکافی)

نیز فرمایا ایک گھنٹہ خدا کے کاموں پر غور و فکر کرنا ستر سال عبادت کے برابر ہے۔ (الحدیث الکافی)

اقبال نے خوب کہا۔

یا وسعت افلاک میں تکبیر مسلسل

یا خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات

وہ مذہب مردان خود آگاہ و خدا مست

یہ مذہب ملا و جمادات و نباتات

خدا فرماتا ہے۔

"اس میں کوئی شک نہیں کہ زمین اور آسمانوں میں مومنوں کے لئے بے شمار دلیلیں اور نشانیاں موجود ہیں۔ خود تمہاری تخلیق' حیوانات کی فراوانی' دن اور رات کے آنے جانے میں' زمین کو زندہ کر دینے والے قطرات باراں میں اور ہواؤں کے رخ بدل بدل کر چلنے میں' عقلمندوں کے لئے دلیلیں موجودہ ہیں۔ یہ اللہ کی وہ آیتیں ہیں جو ہم تمہیں صحیح صحیح سکھا رہے ہیں۔ اگر یہ لوگ ان آیتوں کی پرواہ نہیں کرتے تو پھر اور کون سی دلیلیں ہوں گی جن کی بناء پر وہ اللہ کو دل سے مانیں گے؟ اس بدکار اور جھوٹے پر لعنت ہو جو ہماری ان دلیلوں کو سننے کے بعد بھی اپنی جہالتوں پر جما رہتا ہے' گویا اس نے کچھ سنا ہی نہیں۔ (آج کل کے مسلمانوں کا صحیح نقشہ پیش کیا گیا ہے) ایسے (مدہوش) کو خوفناک عذاب کی خوشخبری سنا دو۔" (جاثیہ ۳-۷)

غور فرمائیں کہ خدا نے آسمانوں اور زمین کی تخلیق پر غور کرنے والوں کو مومن بھی کہا ہے اور عقلمند بھی اور ان سے اعراض کرنے والوں

کو عذاب الیہ کی بشارت سنائی ہے۔ مگر ہم ہیں کہ مظاہر فطرت پر غور و فکر کرنے کی طرف کبھی توجہ ہی نہیں دیتے۔ بقول اقبال۔

اس موج کے ماتم میں روتی ہے بھنور کی آنکھ

دریا سے اٹھی لیکن ساحل سے نہ ٹکرائی

(دو قرآن)

حیات بعد الموت

فرائیڈ نے بتایا کہ لاشعور کا یہ خاصہ ہے کہ وہ انسانی زندگی کے تمام چھوٹے بڑے واقعات کو من وعن محفوظ رکھتا ہے۔ اور وقت کے گزرنے سے کسی واقع کے اندر ذرہ برابر بھی تغیر پیدا نہیں ہوتا۔

دوسری بات جدید علم نفسیات نے یہ بھی بتائی ہے کہ لاشعور کی دنیا وقت اور فاصلے کے قوانین کے عمل سے باہر ہے۔ یہاں فلسفیوں اور سائنس دانوں کی یہ بات غلط ثابت ہوگئی کہ ہمارا ہر ذہنی عمل وقت اور فاصلے کے قوانین کا پابند ہے۔

قرآن نے انسان کے نامہ اعمال کے بارے میں چار باتیں کہیں ہیں۔ (۱) انسان کا نامہ اعمال انسان سے الگ نہیں۔ فرمایا "ہر انسان کے اعمال ہم نے اس کی گردن میں لٹکا دیئے ہیں۔" گویا انسان کا نامہ اعمال صرف اس کی باہر کی قوتیں ہی نہیں لکھتیں بلکہ اس کی اپنی فطرت کی قوتیں بھی لکھ رہی ہیں۔ (۲) انسان کے نامہ اعمال کے اندر اس کے ہر چھوٹے

بڑے عمل درج ہوتے ہیں۔ انسان جب اپنا نامہ اعمال پڑھے گا تو پکار اٹھے گا۔ "یہ کیسی کتاب ہے کہ میرا کوئی چھوٹا یا بڑا عمل ایسا نہیں جو اس میں درج ہونے سے رہ گیا ہو؟" (۳)ہمارا نامہ اعمال موت کے بعد ہمارے ساتھ جاتا ہے اور اس کے مطابق ہمیں جزا سزا ملتی ہے۔ (۴)جدید علم نفسیات کے مطابق بھی ہماری ایک ذہنی زندگی ایسی بھی ہے جو وقت اور فاصلے کے قوانین کی پابندی سے آزاد ہے۔ یہ زندگی مرنے کے بعد بھی جاری رہے گی کیونکہ ہماری موت فاصلے اور وقت کے قوانین کے عمل کا نتیجہ ہے کیونکہ ہمارا لاشعور ان قوانین کے عمل سے دور ہے اس لئے موت لاشعور پر واقع نہیں ہوسکتی۔ موت صرف جسم عنصری پر وارد ہوتی ہے۔ لاشعور میں ہمارے پچاس سال پرانے اعمال بھی محفوظ رہتے ہیں۔ اگر لاشعور ہمارے جسم کا حصہ ہوتا تو ہر تین سال بعد جسم کا ہر ذرہ بدل جاتا۔ جبکہ لاشعور کے دفتر اعمال میں ۱۰۰ سال کے بعد بھی کوئی تغیر، کوئی دھندلاپن، کوئی مغالطے یا شبہ تک پیدا نہیں ہوتا۔ اگر یہ دفتر اعمال جسم سے متعلق ہوتا ہے تو جسم کے کس حصے میں رہتا ہے؟ جب جسم کے تمام ذرات تین سال کے بعد بالکل غائب اور نابود ہوجاتے ہیں تو یہ نامہ اعمال کیوں غائب نہیں ہوتا؟ لہٰذا یہ ماننا ضروری ہے کہ لاشعور جسم سے پیدا نہیں ہوتا بلکہ جسم لاشعور سے پیدا ہوتا ہے اور موت جسم کے لئے ہے لاشعور کے لئے نہیں۔ قرآن کے مطابق :۔

"جو شخص ذرہ برابر نیکی کرے گا اس کی جزا پائے گا اور جو شخص ذرہ برابر برائی کرے گا اس کو دیکھے گا........ ہر جان جو کچھ بھی کمائے گی اس کا پورا پورا بدلہ پائے گی۔ اور ان کے ساتھ کوئی ناانصافی نہ کی جائے گی........ ان پر ذرہ برابر ظلم نہیں کیا جائے گا........ اور خدا تمہارے اعمال میں ذرہ بھر کمی نہیں کرے گا۔" (قرآن)

انسان کا اصل جوہر

انسان کی عظمت کا راز ابدی حقیقتوں کو دل سے مان کر ان کے تقاضوں کو پورا کرنا ہے۔ یہ کام انسان کے عزم ہی سے انجام پاتا ہے۔ انسان کے اندر سب سے بڑا جوہر خود شعوری ہے' جو کائنات کی آخری حقیقت ہے۔ اس خود شعوری کا خاصہ یہ ہے کہ وہ ایک آدرش' ایک حقیقی مقصد حیات سے محبت کرتی ہے۔ اس کا آدرش وہی ہوتا ہے جو اس کے نزدیک حسن وکمال کی انتہا ہوتا ہے۔ اسی آدرش کی محبت کے جذبہ کو پورا سکون صرف اسی وقت مل سکتا ہے جب انسان خدا سے محبت کرنے لگتا ہے۔ اس لئے کہ خدا کی ذات ہی تمام حسن وکمال کی انتہا ہے لیکن اگر انسان خدا کو نہیں جانتا' پہچانتا تو اس کا یہی جذبہ محبت اس کو غلط مقاصد حیات سے محبت کرنے پر مجبور کردیتا ہے۔ کبھی مال ودولت' کرسی' اولاد اس کا آدرش بن جاتے ہیں' کبھی شہرت' فنکاری' دیدہ زیبی اور لوگوں کی تعریف کا حصول اس کا آدرش بن جاتے ہیں۔ غرض کسی نہ کسی

آدرش سے محبت کئے بغیر انسان زندہ نہیں رہ سکتا۔ غلط آدرش سے محبت ہی اسے شرک اور کفر تک لے جاتی ہے اور خدا سے محبت اس کو عمل صالح تک لے جاتی ہے۔ اس لئے کہ آدرش کی محبت کے تقاضوں کو پورا کرنے کا نام ہی عمل صالح ہے۔ آدرش یا زندگی کے اصل مقصد' یا خدا سے محبت کے تقاضوں پر عمل کرنے کے لئے انسان کو مضبوط عزم درکار ہوتا ہے۔ خاص طور پر جبکہ آدرش سے محبت کا تقاضا اس کی فطری خواہشوں کو روکنے پر منحصر ہو۔ اس عزم کا ماخذ انسان کی کوئی جبلت نہیں' بلکہ آدرش کی محبت عزم پیدا کرتی ہے۔ کیونکہ آدرش کی محبت صرف انسان ہی میں پائی جاتی ہے' اس لئے عزم بھی صرف انسان ہی میں پایا جاتا ہے۔ عزم کے ذریعہ انسان جبلتوں کے تقاضوں کو روک کر آدرش کی طبیعت کے تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔ اس وقت ہم کہتے ہیں کہ انسان نے عزم کا اظہار کیا۔ اسی لئے جب حضرت آدمؑ اس درخت کے قریب چلے گئے جس کے پاس جانے سے روکا گیا تھا تو خدا نے فرمایا۔

"ہم نے آدمؑ میں عزم نہ پایا۔"

غرض عزم کا مطلب خواہشات پر قابو پاکر ان کو صرف جائز طریقوں سے پورا کرنا ہوتا ہے۔

بعض دفعہ انسان اپنی جبلت (خواہش) کے طبعی تقاضوں کو ان کی ضرورت سے بھی زیادہ پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہوتی

ہے کہ خدا نے جبلتی تقاضوں کی تسکین میں ایک لذت کا احساس رکھ دیا ہے۔ تاکہ لوگ ہر جبلت کے طبعی تقاضوں کو پورا کرنے کی طرف راغب ہوں لیکن اکثر لوگ اسی لذت پر ایسے مرمٹتے ہیں کہ اس لذت کو اپنا آدرش بنالیتے ہیں اور آخر کار ان کے جذبہ حسن کی تمام کی تمام قوت ان جبلی تقاضوں کی لذت کو حاصل کرنے پر صرف ہوجاتی ہے۔ ایسے ہی لوگ حدود الٰہی کو توڑ کر فاسق اور ظالم بن جاتے ہیں۔ مگر جو لوگ اپنی فطرت کے جذبہ حسن وکمال کے تقاضوں کو پورا کرتے ہیں کہ وہ ہر وہ کام بڑی رغبت سے انجام دیتے ہیں جو ان کے آدرش یعنی خدا کو خوش کرتا ہے۔ پھر وہ اخلاقی اقدار اور احکامات الٰہی کی تعمیل میں عظیم سکون اور آسودگی محسوس کرنے لگتے ہیں۔ اسی کو نفس مطمنہ کہتے ہیں اور ایسے ہی نفس مطمنہ کے مالک لوگ، قلب مطمئن کے ساتھ خوش خوشی اچھے اعمال بھی انجام دیتے ہیں اور خدا ایسے لوگوں کو سیدھے راستے پر چلاکر منزل مقصود (مراد جنت یا خدا کی رضا کے حصول) تک پہنچادیتا ہے۔ یہ وہی لوگ ہوتے ہیں جو خدا سے ملنے کی پوری امید رکھتے ہیں اور خدا کی رضامندی کو اپنا آدرش بناتے ہیں وہ کبھی دنیا کی زندگی اور وقتی کامیابی پر مطمئن نہیں ہوتے۔ کیونکہ وہ خدا کے کلام اور دلیلوں کو پڑھتے رہتے ہیں اور ان پر غور کرتے رہتے ہیں اور اسی کے نتیجے میں وہ اپنی خود شعوری کے جذبہ حسن وکمال کی تسکین ہی کو اپنی زندگی کا حاصل سمجھتے ہیں۔ وہ اپنی اس

زبردست خواہش کی وجہ سے اپنی جبلی خواہشوں کو اپنی حد سے آگے نہیں بڑھنے دیتے۔ وہ ان خواہشوں کو صرف خدا کے احکامات کے حدود کے اندر رہ کر پورا کرتے ہیں کیونکہ ان کے جذبہ حسن و کمال کی خواہش جبلی خواہشات کے زور کی وجہ سے دب نہیں جاتی۔ اس کا سبب یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ خدا کے حسن و کمال و جمال کا ذکر نماز کی شکل میں کرتے رہتے ہیں۔ اس لئے ان کی توجہ اصل حسنِ و کمال پر مرکوز رہتی ہے اور وہ اپنے اسی عزم کی وجہ سے خدا کی رضامندی کے حصول سے خواہش کمال کے تقاضوں کو عملی طور پر پورا کرتے ہیں۔ اس کیفیت میں ہر اچھا عمل انجام دینا بہت آسان ہوجاتا ہے کیونکہ جبلتی خواہشات کی طرف سے کوئی زیادہ سخت رکاوٹ نہیں ہوتی۔ اس لئے اولیاء اور شہداء نیک کاموں کو بڑے ذوق و شوق سے انجام دیتے ہیں۔ اس لئے پروفیسر جیمز کی وہ تعریف جو انہوں نے نیک عمل کے لئے لکھی ہے کہ "یہ وہ عمل ہوتا ہے جو شدید ترین مخالفت کے مقابلے پر ہو" ہمیشہ صحیح نہیں۔ شہید باطل کے لشکروں سے اسی لئے نہیں ڈرتا کہ اس کی خواہش حسن و کمال اس کی جبلت خوف سے بڑھی چڑھی ہوتی ہے۔

اصل میں انسان کی شخصیت کا مرکز انسان کی خودشعوری ہوتی ہے۔ جو جبلتوں کو اپنی ضرورت کے لئے پیدا کرکے اپنے آلہ کار کے طور پر استعمال کرتی ہے اور اس طرح دماغ کی تکمیل کرتی ہے ورنہ انسان کی

خودشعوری صرف اپنے آدرش کو چاہتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ بعض جبلتی خواہشات کی تائید کرتی ہے اور بعض کو حقارت سے رد کردیتی ہے۔ آدرش سے محبت کا جذبہ بیرونی حالات یا ہیجان سے پیدا نہیں ہوتا بلکہ یہ ایک پیدائشی چیز ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ عمر، تجربے اور علم کی ترقی کے ساتھ ساتھ کمال وجمال کی محبت کا معیار بھی ترقی کرتا جاتا ہے۔ یہ جذبہ کبھی زائل نہیں ہوتا۔ البتہ ہمارا آدرش بدلتا رہتا ہے۔ جب ایک آدرش زائل ہوتا ہے تو فوراً اس کی جگہ دوسرا آدرش جگہ لے لیتا ہے کیونکہ ہمارا فطری جذبہ یعنی کمال وجمال سے محبت کا جذبہ اپنے اظہار پانے سے رکنے کو تیار نہیں ہوتا۔ بہرحال انسان میں جبلتی خواہشات بالاخر اسکے آدرش کے تحت رہنی ضروری ہیں۔

جب ہمارا کمال وجمال سے متعلق علم محدود ہوتا ہے تو ہم جبلتی خواہشات کی لذت ہی کو اپنا آدرش بنالیتے ہیں۔ مگر جیسے جیسے ہمارا علم اور آگہی بڑھتی جائے گی ہمارا آدرش جبلتی خواہشات سے بلند ہوتا چلا جائے گا۔ پھر ہم اپنے آدرش کی خاطر اپنے جبلتی خواہشات کو قابو میں لاسکیں گے۔ ایسے بلند انسان کے لئے خوف کا موقع وہ ہوگا جب اس کے جسم کو نہیں بلکہ اس کے آدرش کو خطرہ لاحق ہوگا۔ اس وقت ہماری جبلتیں اور عواطف (جذبات) ہماری محبت کمال وجمال کے خدمت گزار بن جائیں گے۔ محبت کمال ان جبلتوں کے ذریعہ اپنی حفاظت اور اپنی نشوونما کرتی

ہے۔ محبت ان جبلتوں کے ذریعے سے اپنی مختلف کیفیتوں کا اظہار کرتی ہے جب خودشعوری کی محبت کمال وجمال' آدرش کے قریب آرہی ہوتی ہے تو اسے خوشی اور مسرت کا احساس ہوتا ہے لیکن جب حالت برعکس ہوتی ہے تو غم کا احساس ہوتا ہے۔ انسان کا اصل محبوب خدا ہے جو ہر وقت زندہ اور قائم ہے اور اس کے قرب کا احساس ہروقت کیا جاسکتا ہے اس لئے انسان اگر ذہنی طور پر صحتمند ہو تو غم کی کیفیت ہمیشہ باقی نہیں رہتی۔ وہ جلد یا بدیر امید میں بدل جاتی ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ خودشعوری کا فطری یقین کہ وہ ہروقت محبوب کے قریب ہوسکتی ہے' پہلے دب گیا تھا' وہ پھرلوٹ آتا ہے۔

ہمارا جذبہ حسن وکمال یا آدرش سے محبت کا جذبہ ہماری جبلتوں پر حکمران ہے۔ اگر یہ جذبہ جبلتوں کی پیداوار ہوتا تو ان پر کبھی حکمران نہ ہوتا۔ یہی جذبہ انسان کے تمام اعمال کا سرچشمہ ہے۔

سندھ کے عظیم عارف شاہ بھٹائی نے خوب فرمایا۔

جانے کس جستجو میں رہتے ہیں
سوئے مشرق رواں دواں عارف
اک سراپا جمال ہے دل میں
جسے کہتے ہیں جان جاں عارف
سرخروئے غم محبت ہیں
بے نیاز غم جہاں عارف

یہ شہیدان حسن جلوۂ یار
طالبان تجلی دیدار
عزم ہیں ان حسینوں کے بلند
واصل یار ہوں گے آخرکار
شادماں دشت پھرتے ہیں
ان کی نظروں میں ہے جمال نگار
گر یہ چاہے کہ تو بنے عارف
اپنی ہستی کو غرق وحدت کر
یاد رکھو مدعائے ذکر خفی
صرف اس ایک سے محبت کر

خدا سے محبت خدا کی معرفت کے بعد اس کے ذکر و فکر کے ذریعہ ہوتی ہے۔ اسی لئے شاہ صاحب فرماتے ہیں۔

یاد محبوب سے گریز نہ کر
کیا عجیب وہ بھی تجھ کو یاد کرے
ہو کے خوش تیری وضع داری سے
اپنے لطف و کرم سے شاد کرے
اللہ کو جس نے یاد کیا
اللہ اسی کا ہوتا ہے

اور خدا والوں سے محبت اگر خدا کے لئے کی جائے تو وہ بھی خدا ہی

کی محبت ہوتی ہے۔

غالب ندم دوست سے آتی ہے بوئے دوست
مشغول حق ہوں بندگی بوتراب میں

شاہ صاحب نے فرمایا۔

کون ہم بے کسوں کا داتا ہے
تیرے پیاروں سے دل لگاتا ہے

نفس انسانی میں وجود خدا کا اثبات

(قرآن)

"اور جب ہم انسانوں کو کسی مصیبت کے آن پڑنے کے بعد اپنی رحمت کا مزہ چکھاتے ہیں' تو فوراً وہ لوگ ہماری (قدرت' حکمت کی) دلیلوں اور نشانیوں کے بارے میں اپنی ترکیبیں لڑانا شروع کردیتے ہیں' آپؐ ان سے فرمادیں کہ اللہ چال چلنے میں تم سے کہیں زیادہ تیز ہے۔ اس کے فرشتے تمہاری ساری ترکیبوں اور مکاریوں کو لکھتے جارہے ہیں۔(۲۱) وہ اللہ ہی تو ہے جو تم کو خشکی اور تری میں سفر کراتا ہے۔ یہاں تک کہ جب تم کشتیوں میں سوار ہوئے' اور وہ ان مسافروں کو لے کر ہوا کے موافق چلیں' اور وہ اس سفر سے خوش ہوئے ہی تھے کہ اچانک تیز ہوا کے جھکڑ آن پہنچے' اور مسافروں نے سمجھ لیا کہ اب وہ (طوفان میں) پوری طرح سے گھر چکے ہیں' تو اس وقت وہ اپنے ذہن کو صرف اللہ ہی کے لئے خالص کرکے اللہ کو پکارنے لگے (یا) اس وقت وہ اللہ کو پکارنے لگے خالص اسی سے لو لگاتے ہوئے کہ (اے اللہ) اگر تو نے ہمیں اس بلا سے بچالیا' تو ہم ضرور تیرے شکرگزار بندے بن جائیں

گے۔(۲۲) (مگر) اس کے بعد جب خدا نے انہیں بچالیا' تو پھر وہی لوگ ایک دم سے زمین میں ناحق بغاوت کرنے لگے۔ اے لوگو! تمہاری یہ بغاوت خود تمہارے ہی خلاف ہے۔ (یعنی) خدا سے تمہاری اس بغاوت میں خود تمہارا ہی نقصان ہے۔ (کیونکہ) یہ دنیا کے صرف چند دن کے مزے ہیں۔ پھر تو تمہیں ہماری ہی طرف پلٹ کر آنا ہے۔ اس وقت ہم تمہیں بتادیں گے کہ تم کیا کچھ کرتے رہے ہو۔(۲۳) اس دنیا کی مثال تو بس اس پانی کی سی ہے جسے ہم نے آسمان سے اتارا تو اس کے سبب سے زمین کی کھتیاں' جسے آدمی اور جانور سب ہی کھاتے ہیں' مل جل کر پیدا ہوئیں اور خوب سرسبز و شاداب اور گھنی ہوگئیں پھر عین اس وقت جب زمین اپنی بہار پر تھی' (یعنی) خوبصورت ہوکر بن سنور چکی تھی' اور اس کے رہنے والے مالک یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ بس اب تو ہمیں اس پر پورا پورا قابو حاصل ہوگیا ہے کہ یکایک رات میں یا دن میں ہمارا حکم آن پہنچا۔ تو ہم نے اسے ایسا کٹا پٹا' بالکل غارت کرکے رکھ دیا کہ گویا کل وہاں کچھ تھا ہی نہیں۔ اس طرح ہم اپنی باتیں' دلیلیں اور حقیقتیں تفصیل کے ساتھ کھول کھول کر بیان کرتے ہیں' ان لوگوں

کے لئے جو سوچتے، سمجھتے اور غور و فکر سے کام لیتے ہیں۔(۲۴) (تم تو دنیا کے اس دھوکے میں آرہے ہو) اور اللہ تم کو "دارالسلام" یعنی سلامتی کے گھر کی طرف بلا رہا ہے۔ غرض خدا جسے چاہتا ہے سیدھے راستے پر لگا دیتا ہے"۔(۲۵) (سورۂ یونس آیات ۲۱-۲۵)

تشریح :

مفسرین نے لکھا ہے کہ اہل مکہ سات سال تک قحط میں مبتلا رہے جب مرنے لگے تو اللہ نے ان پر رحم فرمایا اور خوب بارشیں برسائیں۔ جب پیٹ بھرا تو خدا کی آیتوں پر جرح کرنے لگے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف چالیں چلنے لگے۔(تفسیر صافی ص ۲۲۲)

ترکیبیں لڑانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ خدا کی نعمتوں اور احسانات کو ماننے کے لئے کسی بھی طرح تیار نہیں ہوتے اور خدا کی نعمتوں کو خدا کی مرضی کے بالکل خلاف استعمال کرتے ہیں یہی دونوں کفران نعمت کی صورتیں ہیں۔ (موضح القرآن)

ان آیتوں میں تمام کائنات کی چیزوں کی بالکل آخری علت فاعلی کی طرف توجہ دلائی گئی ہے تاکہ درمیانی واسطوں سے بلند ہو کر انسان علت حقیقی کو سمجھے۔ انتہائی مصیبت کے وقت فطری طور پر انسان کی توجہ اسباب سے ہٹ کر مسبب الاسباب پر جا ٹھہرتی ہے۔ (تفسیر کبیر)

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے ایک تاجر نے پوچھا کہ میں خدا کو کیسے پہچانوں؟ فرمایا "کیا تم نے کبھی کشتی کا سفر کیا ہے؟" اس نے کہا "ہاں" پوچھا "اس وقت تمہارے دل نے کیا بات کہی؟" اس نے کہا "اس وقت میرے دل نے کہا کہ اس وقت بھی ایک ذات ضرور ایسی ہے کہ وہ اگر چاہے تو بچالے۔" حضرت امامؑ نے فرمایا "بس وہی تمہارا خدا ہے۔" (اصول کافی)

ہر شخص کی زندگی میں لازمی طور پر ایک دفعہ ایسا وقت ضرور آتا ہے کہ وہ جان لیتا ہے کہ اس کا کوئی مالک ہے جو اس کا پالنے والا اور بچانے والا ہے۔ ایک دفعہ اس کا دل اس بات کی گواہی ضرور دیتا ہے۔ پھر چاہے تو انسان اس تجربے کو بھلادے اور چاہے تو یاد رکھے اور خدا کا شکر گزار بن جائے۔

اللہ اپنے بندوں کو اپنے احکامات کے ذریعہ سلامتی کے گھر کی طرف بلاتا ہے۔ یعنی ہم خدا کے احکامات کی تعمیل کرکے سلامتی کے گھر میں داخل ہوسکتے ہیں۔ خدا نے جنت کو دارالسلام اس لئے کہا ہے کہ جو اس میں داخل ہوگیا وہ ہر قسم کی آفت اور بلا سے محفوظ ہوگیا۔ (قرطبی، تفسیر کبیر)

عارفین نے کہا کہ یہ آیت انسانیت کے لئے خوشخبری بھی ہے اور عبرت بھی۔ منکرین کے لئے یہ آیت سرزنش ہے کہ وہ کیسی کیسی عظیم

نعمتوں سے محروم رہے جا رہے ہیں۔ اور خدا کے عاشقوں کے لئے یہ آیت بشارت ہے کہ ان کو خلوت خاص کے اشارے مل رہے ہیں۔ اور خدا کے ماننے والوں کے لئے یہ آیت مژدہ جاں فزا ہے کہ ان کو خدا کی ہدایت، توفیقات اور ابدی سلامتی کی خوشخبری سنائی جا رہی ہے۔

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت ہے کہ جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا کہ "اسلام اللہ کا نام ہے جس کا مظہر جنت ہے۔ جو خدا نے اپنے چاہنے والے دوستوں اور اطاعت کرنے والے مومنین کے لئے پیدا کی ہے۔" (تفسیر صافی ص ۲۲۲)

غرض انتہائی بے بصیرت اور مردہ ضمیر انسان بھی اپنی انتہائی ناکامیوں اور مایوسیوں میں اپنے دل کی گہرائیوں میں بے اختیار اللہ کو پکار اٹھتا ہے۔ کیا یہ بات دل کی فطرت اور خالق و مخلوق کے فطری ربط کا پتہ نہیں دیتی؟ یہی فطری ہدایت ہے جس کا ذکر اس آیت میں کیا گیا ہے۔ اس آیت کو ہماری فطرت کا جزو بنا دیا گیا ہے۔ اس لئے انسان کا فطری تصور توحید ہے۔ ڈبلیو ۔ سمینٹ پروفیسر وائن یونیورسٹی لکھتے ہیں۔

"گو اب یہ بات تحقیق سے ثابت ہو چکی ہے کہ انسان کا ابتدائی تصور توحید پر مبنی ہے۔ یعنی قدیم ترین انسان خدا کے واحد کو مانتا تھا، اس کا دین پوری طرح ایک توحیدی دین تھا۔ یہ حقیقت اب اس درجہ ثابت ہو چکی ہے کہ اب اس کا انکار ممکن نہیں"۔

نسل انسانی کے قدیم ترین پستہ قد قبائل میں اکثروں کی نسبت یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے۔ اس طرح ابتدائی عہد کے جنگلی قبیلوں کی نسبت جس قدر تاریخی مواد مہیا ہوا ہے' ان سب کی تحقیقات ہمیں اس نتیجہ پر پہنچاتی ہے۔

ارکنک تہذیب کے قبیلوں کے روایتی آثار اور شمالی امریکہ کے ذہنی تصورات کی تاریخ بھی بالآخر اس نتیجہ پر پہنچی ہے۔

اور عقیدہ توحید کے برحق ہونے کی یہ نشانی یا دلیل ہر انسان کے نفس میں آج بھی موجود ہے کہ جب زندگی خوشحال اور سازگار ہوتی ہے تو انسان خدا کو بھولا اور دنیا کی نعمتوں پر پھولا رہتا ہے۔ مگر جہاں اسباب نے ساتھ چھوڑا وہ سب سہارے جن پر تکیہ تھا' ٹوٹے پھر کٹر سے کٹر مشرک اور سخت سے سخت دہریے کا دل بھی یہ گواہی دینے لگتا ہے کہ اس سارے عالم اسباب پر کوئی خدا کارفرما ہے وہی ایک خدا ہے جو ہر چیز پر قادر ہے۔ بقول شاعر

جب کیا تنگ بتوں نے تو خدا یاد آیا

دنیاوی مصائب اور اس کے اسباب

ان مصائب کی ۵ قسمیں ہیں (۱) افراد اور اقوام کی سرکشی کبھی کبھی خدا کی مرضی سے اس قدر شدت کے ساتھ ٹکرانے لگتی ہے کہ اس تصادم کا شرارہ کل جہنم میں بھڑکنے کے بجائے آج ہی بھڑک اٹھتا ہے۔ عالم میں جب کبھی تباہیاں آئی ہیں اس قانون کے تحت آئی ہیں۔ غرض افراد و اقوام کے مصائب زیادہ تر ان کے گناہوں اور مظالم کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ خاص کر باطنی آفتیں تو اسی سبب سے آتی ہیں۔ ان آفتوں کے آنے کے بعد انسان میں جذبہ امانت اور اطاعت مرجاتا ہے۔

(۲) مصائب کی دوسری قسم امتحانی ہوتی ہے۔ ان مصائب کا اکثر حصہ اختیاری ہوتا ہے۔ یہ مصائب کبھی کبھی بلند مرتبہ لوگوں کے بلند مرتبہ کو دکھانے اور ہمارے لئے مثال قائم کرنے کے لئے ہوتے ہیں۔ جیسے انبیاءؑ اور اولیاءؒ کے مصائب۔ یہ مصائب ان کی لذت ایمانی' یقین' صبر' خدا سے عشق و محبت کے اعلیٰ ترین جذبات کے اظہار کے لئے' بلکہ ان کی بڑائی کا اظہار ہوتا ہے۔

(۳) کبھی کبھی یہ مصائب سچوں کے سچ کو ثابت کرنے اور منافقوں کو ان سے جدا کرنے کے لئے بھی بھیجے جاتے ہیں۔

(۴) کبھی آخرت کی سخت سزا کو زندگی کی ہلکی سزا سے بدل دیا جاتا ہے۔ گویا سخت سزا کے بدلے دنیا کی مصیبتوں کی ہلکی سزا دے کر ان کو پاک

کردیا جاتا ہے۔ سلسلہ مصائب میں اس قسم کے مصائب کا نام تخفیف و تحویل ہے اور یہ مصائب ہمارے گناہوں کا کفارہ ہوجاتے ہیں۔

(۵) مصائب کی ایک قسم وہ بھی ہے کہ جسے عام لوگ تو مصیبت سمجھتے ہیں لیکن جو شخص وہ مصیبتیں اختیاراً" برداشت کرتا ہے' وہ انہیں میں اپنی راحت کو تلاش کرتا ہے۔ مثلاً حاجتوں کا مختصر کردینا' بے کار بے ہودہ باتوں سے دور رہنا' قدر ضرورت پر کفایت کرنا۔ ان باتوں کو غافل سزا یا عذاب سمجھتے ہیں لیکن عرفاء اس میں اپنی نجات اور راحت پاتے ہیں۔

مصیبتوں کا علاج

ان مصیبتوں کا اصل علاج یہ ہے کہ (ا) انسان خدا کی مرضی سے نہ ٹکرائے اور اس طرح مقام عبدیت سے نہ ہٹے۔ کیونکہ اکثر مصائب اور تکالیف مرضی حق سے ٹکرانے کا خمیازہ ہوتے ہیں۔ اس لئے اس کا حقیقی علاج یہ ہے کہ انسان پلٹ کر پھر اسی نقطے تک آجائے جہاں سے ہٹ کر وہ خدا کی مرضی سے ٹکرایا تھا۔ اسی حرکت بازگشت یا باطنی گردش کا نام توبہ ہے۔ یعنی جس خدا کی مرضی سے ٹکرایا تھا اس کی طرف پلٹ کر اس سے رحم اور معافی کی درخواست کرے۔ اس کو استغفار کہتے ہیں۔ بدی کے بدلے نیکیوں کے کام کرے تو یہی نیکیاں مثلاً صدقات' خیرات' نماز' روزے' لوگوں کے کام آنا اس کے پچھلے گناہوں کا کفارہ بن جاتے ہیں۔ خدا فرماتا ہے۔

"نیکیاں برائیوں کو ختم کردیتی ہیں۔"

مسئلہ شفاعت

(۲)اس کا دوسرا علاج یہ بھی ہے کہ غم زدہ انسان اپنے اندر خاصان خدا کی محبت اور پیروی کا جذبہ پیدا کرے تاکہ خاصان خدا بھی اس کے لئے دعا کریں۔ اور خدا اپنے خاص بندوں کی دعاؤں کی وجہ سے ہمیں دنیا اور آخرت کی تکلیفوں سے نجات عطا فرمائے اسی کو شفاعت کہتے ہیں۔

شفاعت کے بارے میں یہ خیال بالکل غلط ہے کہ جس طرح ہم دوسروں کی خوشامد اور بے جا تعریفوں سے خوش ہوتے ہیں' اسی طرح خاصان خدا ہم سے اس وقت خوش ہوں گے کہ ہم ان کے سامنے سجدے کرنے لگیں گے یا ان کی بے جا تعریفیں کرنے لگیں گے۔ خاصان خدا صرف اسی وقت ہم سے خوش ہوتے ہیں جب ہم ان کی طرح خدا کی اطاعت کرتے ہیں۔ نیکیوں اور بھلائیوں کے کام انجام دیتے ہیں۔ اس لئے جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا گیا کہ آپ کی شفاعت کا سب سے زیادہ مستحق کون ہے؟ فرمایا "جس نے دل سے کلمہ لا الہ الا اللہ کہا۔" یعنی توحید کے معاملے میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیروی کی۔ (ماخوذ کتاب الدین القیم)

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے کہ جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

لا تنال ولایتنا الا بالطاعۃ

"ہماری ولایت (سرپرستی) سوا خدا کی اطاعت کے حاصل نہیں ہوسکتی۔"

(۳) مصائب اور تکالیف سے نجات کا تیسرا طریقہ یہ ہے کہ ہم خدا کی رحمت سے امید نجات رکھیں۔ اگرچہ قانون مکافات کے مطابق اپنے گناہوں پر سزا کے واقعا" ہم مستحق ضرور ہیں' لیکن وہی خدا جس نے یہ قانون مکافات کو جاری کیا ہے وہی خدا خود چاہے تو ہمیں اپنے بنائے ہوئے قانون مکافات کے نتائج سے بچا سکتا ہے۔ اس لئے کہ اول تو اس نے خود یہ فرمایا کہ "میری رحمت میرے غضب سے وسیع تر ہے۔" پھر اس نے یہ بھی فرمایا ہے کہ "وہ تمام رحم کرنے والوں سے کہیں زیادہ رحم کرنے والا ہے۔" نیز یہ کہ اس نے خود چاہا کہ ہم اس سے حسن ظن رکھیں اور اس کی رحمت پر تکیہ کریں کیونکہ اس نے خود فرمایا۔

"خدا ہرگز اس بات کو تو نہ بخشے گا کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا جائے۔ لیکن اس کے سوا جس گناہ کو چاہے گا بخش دے گا۔"

یعنی جو شخص اپنی بندگی کو صرف خدا کے ساتھ تو مخصوص نہیں کرتا' بلکہ دوسروں کو بھی اپنی بندگی میں شریک کرتا ہے' یہ وہ جرم ہے کہ جو معاف نہ کیا جائے گا۔ کیونکہ ایسا آدمی عبدیت کے کلی دستور کو اپنے وجود کا نصب العین نہیں ٹھہراتا اور خدا کے سوا اور دوسرے کو اپنا خدا سمجھتا

ہے۔ ایسا آدمی خدا کے قانون سزا سے کبھی نہیں بچ سکتا کیونکہ وہ بغاوت کلی کا مرتکب ہوتا ہے۔ وہ خدا کی حکومت میں رہنے والے بندوں پر خدا کے سوا غیرخدا کے قانون کو نافذ کرتا ہے۔

لیکن جو شخص عبدیت کے کلی دستور کو دل سے مانتا ہے اور خدا کے سوا کسی کو اپنا پالنے والا مالک اور خالق نہیں سمجھتا' لیکن زندگی کے عملی معاملات میں اس کی زندگی کا کوئی رخ کبھی کبھی خدا کی مرضی سے ٹکراجاتا ہے لیکن کیونکہ کلی بغاوت کے نہ مٹنے والے داغ سے اس کا دامن پاک ہے' اس لئے خدا اگر چاہے تو اپنے قانون مکافات کے نتائج سے ایسے مجرم کو مستثنیٰ کردیتا ہے کیونکہ بہرحال وہ باغی نہیں ہے۔ صرف مجرم ہے۔ اور اسکا گناہ یہ ہے کہ وہ اپنی خواہشات کے زور دار دھارے کی رو میں بہہ گیا تھا۔ اسی لئے حضرت علی علیہ السلام نے اپنی دعا میں فرمایا۔ "خدایا! میری لغزشوں کو معاف کردے اس لئے کہ میں تیرا باغی نہیں' مجھے تو میری خواہشات کی رو نے پھسلادیا اور دنیا کی ترغیبات نے مجھے دھوکے میں ڈال دیا۔" (دعائے کمیل)

شرک کی نفی توحید ہے یعنی صرف خدا کی عاجزانہ اطاعت وہ بھی بلا شرکت غیری۔ اور اسی اطاعت وبندگی کو اپنی زندگی کا حقیقی نصب العین ٹھہرانا۔ ظاہر ہے کہ اس نصب العین کو پورا کرنے کے لئے لازمی ہوتا ہے کہ ہم نبیؐ کی نبوت' ہدایات اور آسمانی کتاب کو مانیں اور اس پر عمل

کریں۔ اس لئے کہ خدا ہم کو براہ راست اپنی مرضی نہیں بتاتا۔ وہ رسولوں کے ذریعہ بتاتا ہے۔ اب اگر کوئی شخص نبیؐ کو نہ مانے اور اپنے خود تراشیدہ خیالات اور وسوسوں کو خدا کی مرضی قرار دیدے تو ایسا شخص خدا کا باغی بھی ہے اور خدا پر بہتان بھی تراش رہا ہے۔ گویا ایسا آدمی مشرک سے بھی بدتر ہے۔ وہ بیک وقت بغاوت کا جرم بھی کررہا ہے اور خدا پر الزام تراشیاں بھی کررہا ہے۔ ایسی صورت میں انسان اصل میں اپنی خواہشوں ہی کی بندگی کرتا ہے انہیں کو اپنا نصب العین بناکر اس کا نام خدا کی اطاعت دے دیتا ہے۔

اس بحث سے معلوم ہوا کہ ہمیں ابدی ہلاکت اور مصیبتوں سے بچنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم شرک اور خدا پر الزام تراشیوں کے جرم سے بچیں اس کا واحد طریقہ حقیقی توحید پر اور خدا کے بھیجے ہوئے رسولوں اور کتابوں پر ایمان لانا ہے اور خدا کو خدائے واحد ماننے کا عملی مطلب یہ ہے کہ خدا کی مرضی کی اطاعت اور اس کی بندگی کو اپنے وجود کا آخری مقصد، مطلب اور ہدف سمجھا جائے اور اس مقصد کو عملاً پورا کرنے کے لئے لا الہ الا اللہ کے بعد محمد رسول اللہ پر ضرور ایمان لانا ہوگا۔ جو دوسرے کلمہ یعنی محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم پر ایمان نہیں لاتا، وہ حقیقتاً" توحید پر ہی ایمان نہیں لاتا۔ کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو مانے بغیر وہ خدا کی مرضی پر چل ہی نہیں سکتا۔ اب اس کے لئے اس کے سوا کوئی

چارہ نہیں کہ یا تو عملاً کسی اور خدا کی بندگی اختیار کرکے مشرک ہوجائے یا خدا پر اپنی طرف سے جھوٹ باندھ کر خدا پر الزام تراشیوں کے عظیم جرم کا مرتکب ہوتا رہے۔ ایسے ہی لوگوں کے لئے خدا نے فرمایا ہے۔

"جو لوگ اللہ یا اس کے رسولوں کا انکار کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور رسولوں میں جدائی ڈال دیں' وہ کہتے ہیں کہ ہم کچھ باتوں کو مانتے ہیں اور کچھ کا انکار کرتے ہیں اور اس طرح چاہتے ہیں کہ ایک درمیانی راہ نکال لیں (یعنی اپنی مرضی پر بھی عمل کریں اور خدا کی مرضی پر بھی) تو یہ لوگ پکے کافر ہیں اور ہم نے ایسے کافروں کے لئے دکھ بھری سزا بالکل تیار کر رکھی ہے۔" (سورۂ نساء)

مصائب سے بچنے کیلئے کچھ آیات کا ورد

آئمہ اہل بیتؑ سے پہنچی ہوئی احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ آیات قرآنی ایسی ہیں کہ جو مصائب زمانہ سے بچانے میں کارگر ہیں۔

مثلاً (۱) فقر وفاقے کی مصیبت کا علاج یہ ہے کہ انسان صبح اور عصر کی نماز کے بعد ایک تسبیح استغفراللہ ربی کی سمجھ کر پڑھے۔ یعنی خدا سے یوں کہے کہ میں تجھ سے اپنے گناہوں اور زیادتیوں کی معافی طلب کرتا ہوں۔ اول آخر درود پڑھے۔ کیونکہ قرآن میں خدا نے فرمایا ہے کہ "اگر تم اپنے گناہوں کی معافی طلب کرو گے تو خدا تم پر اپنی رحمتوں کی موسلا دھار بارش برسائے گا اور تمہاری قوت میں اور اضافہ فرمائے گا"۔ اس لئے

استغفار کا یہ عمل خدا کی رحمت کو ہماری طرف متوجہ کرتا ہے جس سے فقر وفاقہ اور دوسری مصیبتیں رد ہو جاتی ہیں۔

حضرت امام حسن علیہ السلام سے کسی نے پوچھا کہ میرے اولاد نرینہ نہیں ہوتی کوئی طریقہ تعلیم فرمائیں۔ آپ نے استغفار کو ستر مرتبہ پڑھنے کا حکم دیا۔ وہ صاحب اولاد ہوگیا۔ اس نے یہ بات امیر معاویہ کو بتائی۔ انہوں نے حضرت امام حسن علیہ السلام کو لکھا کہ آپ نے یہ طریقہ قرآن کی کس آیت سے معلوم کیا؟ حضرت امامؑ نے یہی آیت لکھی اور لکھا کہ اس آیت میں خدا نے فرمایا ہے کہ "اگر تم استغفار کرو گے تو ہم تمہاری قوت میں اور اضافہ کریں گے۔" کیونکہ اولاد نرینہ انسان کی قوت ہوتی ہے۔ اس لئے میں نے اس آیت کے مطابق استغفار کا حکم دیا۔

استغفار کا تیسرا فائدہ یہ ہے کہ ہماری دعائیں قبول ہونے لگتی ہیں کیونکہ حضرت علیؑ نے فرمایا ہے "اے خدا میرے ان گناہوں کو معاف فرمادے جن کی وجہ سے میری دعائیں قبول نہیں ہوتیں۔"

استغفار کا چوتھا فائدہ یہ ہے کہ ہم جن مصیبتوں میں گھرے ہوتے ہیں، وہ ٹل جاتی ہے۔ اس لئے کہ ہماری اکثر مصیبتیں ہمارے ان گناہ کا نتیجہ ہوتی ہیں کیونکہ استغفار سے گناہ معاف ہو جاتے ہیں اس لئے ان کی وجہ سے آئی ہوئی مصیبتیں بھی ٹل جاتی ہیں۔ حضرت علی علیہ السلام نے اپنی دعا کمیل میں فرمایا۔ "خداوند! میرے ان گناہوں کو معاف فرمادے

جن کی وجہ سے مجھ پر مصیبتیں ٹوٹتی ہیں۔"(دعائے کمیل)

فقروفاقے کا علاج

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص ہر نماز فریضہ کے بعد اور گھر میں داخل ہوتے ہوئے تین مرتبہ سورۂ اخلاص کی تلاوت کرے گا تو مالا مال ہوجائے گا۔ فرمایا اگر ایک دفعہ پڑھے گا تو خود مالا مال ہوجائے گا۔ اگر دو دفعہ سمجھ کر پڑھے تو گھر والے مالا مال ہوجائیں گے اور اگر تین دفعہ سمجھ کر پڑھے گا تو اہل محلّہ بھی مالا مال ہوجائیں گے۔"

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا کہ جو شخص یہ چاہتا ہے کہ کسی مصیبت میں گرفتار نہ ہو تو اس کو چاہئے کہ "**حسبنا اللہ ونعم الوکیل نعم المولی ونعم النصیر**" یعنی ہمارے لئے اللہ کافی ہے۔ وہ ہمارا بہترین سرپرست ہے۔ وہی ہمارا بہترین آقا اور بہترین مددگار ہے اس لئے کہ خدا نے اس آیت کے فوراً بعد فرمایا۔

"ان کو کسی قسم کی مصیبت نے نہ چھوا" ہر نماز کے بعد دن میں کسی وقت اس آیت کی ایک تسبیح پڑھ لینی چاہئے۔

خدا نے حضرت یونسؑ کو مچھلی کے پیٹ میں نجات عطا فرمائی۔ قرآن میں ہے کہ اگر وہ خدا کی تسبیح نہ کرتے تو قیامت تک مچھلی کے پیٹ ہی میں رہتے۔ حضرت یونس کی تسبیح یہ تھی۔

"لا الہ الا انت سبحانک انی کنت من الظالمین"

(یعنی) خدا کے سوا کوئی خدا نہیں تو ہر عیب سے پاک ہے۔ میں ظلم، زیادتی اور گناہ کرنے والا ہوں۔"

نماز صبح یا نماز عشاء کے بعد ایک تسبیح اس آیت کی تلاوت کرنا بے پناہ مصیبتوں سے بچاتا ہے۔

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا کہ جو شخص صبح کی نماز کے بعد تیس مرتبہ یہ آیت پڑھے گا وہ مالا مال ہو جائے گا۔ آیت یہ ہے۔ "لا الہ الا انت الملک الحق المبین۔" (یعنی) کوئی خدا نہیں سوا ایک خدا کے۔ تو ہی بادشاہ ہے، سب سے بڑی حقیقت ہے اور برحق کھلا ہوا حکمران ہے۔

حضرت امام محمد تقی علیہ السلام نے فرمایا کہ جو شخص عصر کی نماز کے بعد دس مرتبہ سورۂ انزلنا پڑھتا ہے اسکے نامہ اعمال میں اتنا ثواب لکھا جاتا ہے جو اس دن سارے جن وانس کو دیا جاتا ہے اور جو شخص سورۂ انزلنا عشاء کی نماز کے بعد سات مرتبہ پڑھتا ہے تو وہ ہر قسم کے مالی نقصانات سے بچالیا جاتا ہے۔

خمس، زکوٰۃ اور صدقات ادا کرنے والا کبھی فقیر نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ خدا نے قرآن میں فرمایا ہے۔ "شیطان تم سے (مال خدا کی راہ میں خرچ کرتے وقت) فقر وفاقہ کا وعدہ کرتا ہے جبکہ خدا تم سے تمہارے

گناہوں کی معافی اور اپنی طرف سے فضل یعنی نعمتوں کے زیادہ کرنے کا وعدہ کرتا ہے۔"

تجربہ گواہ ہے کہ آج تک وہ لوگ اور وہ خاندان کبھی فقروفاقے کے شکار نہیں ہوئے جو زکوٰۃ خمس اور صدقات باقاعدگی سے ادا کرتے ہیں۔

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت ہے کہ جناب رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا۔

"صدقات ادا کرکے روزی طلب کرو۔"

"صدقات مصیبتوں کو ٹال دیا کرتے ہیں۔"

"صدقات ادا کرنے سے عمر بڑھتی ہے اور انسان بری موت سے بچ جاتا ہے۔"

آیات قرآن

"ان سے پوچھو کہ آخر کون ہے جو تم کو آسمانوں اور زمین میں سے روزی دیتا ہے؟ یہ سننے اور دیکھنے کی صلاحیتیں (دینا) بھلا کس کے اختیار میں ہے؟ کون ہے جو بے جان میں سے جاندار کو اور جاندار میں سے بے جان (مادوں) کو نکالتا ہے؟ کون ہے جو پوری کائنات کا نظام چلا رہا ہے؟ اس پر وہ ضرور کہیں گے کہ "وہ اللہ ہے" تو کہو کہ پھر تم اتنی بڑی طاقت اور حقیقت کی مخالفت اور ناراضگی سے کیوں نہیں بچتے؟(۳۱) غرض وہی اللہ تو تمہارا حقیقی پالنے والا مالک ہے۔ پھر اتنی بڑی حقیقت کو چھوڑ دینے کے بعد گمراہی کے سوا اور کیا باقی رہ سکتا ہے؟ آخر تم کدھر بھکے چلے جارہے ہو؟(۳۲) غرض اس طرح (کھلی ہوئی عام فہم دلیلوں کے پیش کرنے کے بعد بھی) برے کام کرنے والے خدا کے نافرمانوں کے لئے تمہارے پالنے والے مالک کی بات بالکل سچ ثابت ہو کر رہی کہ وہ کسی بھی طرح حق (خدا) کو مان کر ہی نہ دیں گے۔(۳۳) ان سے پوچھو! کیا تمہارے (خدا کے ساتھ ٹھہرائے ہوئے خدا کے) شریکوں میں سے کوئی ہے جو کائنات کی تخلیق کی ابتدا کر سکتا ہو؟

اور اس کو (فنا کرنے کے بعد) دوبارہ بھی پیدا کر سکتا ہو؟ کہو کہ وہ صرف (اور صرف) اللہ ہے جو کائنات کی تخلیق کی ابتدا بھی کرتا اور اسے دوبارہ بھی زندہ کرے گا۔ پھر آخر تم کس لئے الٹے الٹے راستے پر چلائے جارہے ہو؟(۳۴) ان سے پوچھو کہ کیا (تمہارے بنائے ہوئے خدا کے) شریکوں میں سے کوئی ہے جو حق کی طرف ہدایت کرتا ہو؟ کہو کہ وہ صرف اللہ ہی ہے جو حق کی طرف ہدایت کرتا ہے؟ تو کیا جو حق کی طرف ہدایت کرے' وہ اس بات کا زیادہ حقدار (نہیں) ہے کہ اس کی پیروی کی جائے؟ یا اس کی پیروی کی جائے جو خود اس وقت تک سیدھا راستہ ہی نہ پائے جب تک کہ اسے راستہ نہ دکھایا جائے؟ تو آخر تمہیں کیا ہوگیا ہے؟ کیسے (الٹے الٹے) فیصلے کرتے ہو؟ ان میں کے اکثر لوگ صرف اپنے وہم وگمان اور قیاس آرائیوں کی پیروی کرتے ہیں حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ (ایسے بے سروپا) وہم وگمان حق تک پہنچنے میں کوئی فائدہ نہیں دیتے۔ اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ یہ لوگ جو کچھ بھی کررہے ہیں' اللہ اس کو خوب جانتا ہے۔(۳۶) یہ قرآن ایسا ہے ہی نہیں کہ جو اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے غلط طور پر بنادیا جاسکے بلکہ

یہ تو تصدیق ہے اس کی جو کہ پہلے آچکا ہے' اور پھر یہ قانون الٰہی کی تفصیل بھی ہے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ (قرآن تمام) کائنات کے مالک اور تمام جہانوں کے پالنے والے آقا کی طرف سے ہے۔(۳۷) کیا وہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ اسے (قرآن) پیغمبرؐ نے اپنی طرف سے گھڑ لیا ہے؟ کہو کہ اگر تم سچے ہو تو پھر اس جیسا ایک سورہ ہی بنا کر لے آؤ اور بس ایک خدا کو چھوڑ کر جس جس کو اپنی مدد کے لئے بلا سکتے ہو' اسے بلاؤ۔(۳۸) بلکہ (حقیقتاً) ان لوگوں نے اس چیز کو جھٹلایا ہے جس کے علم پر وہ حاوی بھی نہیں ہیں۔ (یعنی جس کو وہ پوری طرح جانتے بھی نہیں ہیں) اور جس کی حقیقت ابھی تک ان کے سامنے نہیں آئی ہے۔ اسی طرح وہ لوگ بھی جھٹلاتے رہے ہیں' جو ان سے پہلے تھے تو دیکھ لو کہ کیا انجام ہوا ان ظالموں کا۔(۳۹) (سورہ یونس آیات ۳۱ سے ۳۹)

تشریح :

ہر شخص جانتا ہے کہ سننے اور دیکھنے کی صلاحیت خود ہم نے پیدا نہیں کی اور نہ اتنی اعلیٰ صلاحیتیں از خود پیدا ہو سکتی ہیں۔ اس لئے ماننا پڑتا ہے کہ خدا ہی نے انسان کو سننے اور دیکھنے کی صلاحیتیں عطا فرمائی ہیں اور

اس کی اجازت سے یہ طاقتیں کام بھی کرتی رہتی ہیں۔ (تفسیر تبیان)

بقول شاعر۔

وہم و گمان و عقل و نظر سب ہی جا چکے

بس ہم بھی جانے والے ہیں' سامان تو گیا

خدا کا فرمان ہے کہ جاندار کو بے جان سے نکالتا ہے اور بے جان کو جاندار سے نکالتا ہے تو اس کی مثال یہ ہے کہ خدا جاندار کو بے جان نطفہ سے پیدا کرتا ہے اور بے جان نطفہ کو جاندار سے نکالتا ہے۔ (فتح الرحمٰن)

ان آیتوں میں یہ بات وضاحت سے سمجھادی گئی ہے کہ تمہاری ابتدا کا سرا بھی خدا کے ہاتھ میں ہے' اور تمہاری انتہا کا سرا بھی خدا ہی کے ہاتھ میں ہے۔ اب ان دونوں سروں کے بیچ میں تم کسی دوسرے کی بندگی کیوں اختیار کر رہے ہو؟ یا خدا کی بندگی کیوں اختیار نہیں کرتے؟

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت ہے کہ خدا کا فرمانا "جو حق کی طرف ہدایت کرتے ہیں۔" سے اولین مراد رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے بعد آل محمدؑ ہیں۔ (جنہیں خدا نے اپنی طرف سے ہدایتیں پہنچانے کا ذریعہ بنایا ہے) اور "جو لوگ خود ہدایت نہیں پاتے" ان سے مراد قریش اور وہ سب لوگ ہیں جو (خدا)' رسول خدا صلی اللہ

علیہ و آلہ وسلم اور ان کے اہل بیتؑ کے مخالف ہیں"۔(تفسیر صافی ص ۲۲۳ بحوالہ تفسیر قمی)

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا "اگر کوئی اور خدا ہوتا تو اس کے رسول بھی ضرور آتے اور اس کی حکومت، حکمت اور سلطنت کے آثار بھی تمہیں دکھائی دیتے۔" (نہج البلاغہ)

آخری آیتوں میں خدا نے قرآن کو اپنے وجود اور رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی صداقت کی دلیل قرار دیا ہے۔ اس میں چیلنج دیا گیا ہے کہ ساری کائنات مل کر بھی اس کتاب کے ایک سورے کا بھی جواب نہیں لاسکتی۔ یہ چیلنج آج بھی موجود ہے۔ اگر دنیا کے لئے قرآن کا جواب لانا ممکن ہوتا تو تیرہ سو سال سے اسلام دشمن طاقتیں کوئی ایک سورۂ تو بنوا کر پیش کرتیں۔ یہ دلیل ہے کہ یہ کتاب ایسی ذات نے بھیجی ہے جو ہر چیز پر قادر ہے۔ نیز یہ کہ یہ کتاب (۱) پچھلی آسمانی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے۔ (۲) اس میں خدائی احکامات موجود ہیں۔ (۳) اس کتاب میں ہر چیز قطعی اور یقینی ہے۔ (۴) یہ کتاب ساری کائنات کے پالنے والے مالک کی طرف سے ہے۔ (۵) یہ کتاب بے مثل کتاب ہے۔

ان آیتوں سے محققین نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ہر وہ بات جو ہمیں

معلوم نہ ہو اور ہمارا علم اس کا پورا پورا احاطہ نہ کرسکے' اس کا انکار جہالت ہے۔ اس طرح خدا کا وجود اور اس کی ہستی کا ہم پوری پوری طرح احاطہ نہ کرسکیں تو اس کے وجود کا انکار جہالت ہوتا ہے۔ (تفسیر علی ابن ابراہیم)

دوسری اہم بات یہ سمجھ لینی چاہئے کہ دنیا میں انسان کی ضرورتوں کا دائرہ صرف اسی حد تک محدود نہیں ہے کہ اسکے کھانے' پینے' پہننے' رہنے' سہنے کا سامان فراہم کردیا جائے۔ بیماریوں' آفتوں' مصیبتوں اور نقصانات سے محفوظ کردیا جائے۔ انسان کی ایک سب سے بڑی ضرورت یہ بھی ہے کہ اسے دنیا میں صحیح طریقے سے زندگی بسر کرنے کا طریقہ اور زندگی گزارنے کا اصل مقصد بھی بتادیا جائے۔ تاکہ اس کی زندگی بامعنی ہوکر اعلیٰ اقدار سے وابستہ ہوجائے۔ تاکہ وہ تمام دوسرے انسانوں کے ساتھ اور پورے نظام کائنات کے ساتھ ہم آہنگ ہوکر امن وسکون اور اطمینان کے ساتھ زندگی گزار سکے۔ اور تاکہ اس کی محنتیں اور کوششیں غلط راہوں کی طرف جاکر برباد نہ ہوجائیں۔ اسی صحیح طریقہ زندگی کا نام "حق" ہے اور جو رہنمائی انسان کو اس "حق" کی طرف لے جاتی ہے اسی کو ہدایات کہتے ہیں۔ اب خدا سارے عالم شرک سے پوچھ رہا ہے کہ کیا

تمہارے یہ بے عقل اور بے بس خدا یا آج کے سرمایہ دار' عالم' وڈیرے اور خون آشام عالمی طاقتیں تمہارے لئے حق کی طرف ہدایت کرنے کا ذریعہ بن سکتی ہیں؟ اس کا جواب ہر صاحب عقل نفی میں دے گا۔ یہ ہدایت صرف خدا ہی کی طرف سے آئی ہے اور آتی رہی ہے۔ آج تک کسی مشرک کے کسی معبود نے اخلاق' معاشرت' تمدن' معیشت' سیاست' قانون عدالت' انسانیت' شرافت کے اصول نہیں بنائے۔ رہے انسان کے بنائے ہوئے اصول اور قوانین تو وہ انسانوں کی طرح ناقص اور ادھورے' یک طرفہ ہوتے ہیں۔ انسان کی کمزوریوں اور تعصبات اور شخصی اور گروہی دلچسپیوں کے مظہراور اس کی ذاتی اغراض' رجحانات اور میلانات کے مظہرہوتے ہیں۔ اس کے یہی میلانات اسے منصفانہ قوانین نہیں بنانے دیتے اس لئے انسان اس میں بھی خدا کی رہنمائی کا محتاج ہے۔(تفہیم)

آیات قرآن

یہ جان لینا چاہئے کہ اللہ ہی کی ملکیت میں وہ سب کے سب جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں اور تم جو اللہ کو چھوڑ کر (اپنے بنائے ہوئے) خدا کے شریکوں کو پکار رہے ہو' وہ بھلا کس کے پیچھے چلتے ہیں؟ وہ تو صرف الٹے سیدھے وہم وگمان کے پیچھے بھاگتے ہیں اور محض قیاس آرائیاں اور انکل پچو باتیں بناتے ہیں۔(۶۶) (جبکہ) وہ اللہ ہی تو ہے کہ جس نے تمہارے لئے رات بنائی کہ اس میں تم سکون حاصل کرو۔ اور دن کو روشن اور دیکھنے والا بنایا اس میں دلیلیں اور خدا کی نشانیاں ہیں' ان لوگوں کے لئے جو سنتے (اور غور کرتے) ہیں"۔(۶۷)

ان لوگوں نے کہہ دیا کہ اللہ نے اپنا ایک بیٹا بنایا ہے۔ سبحان اللہ (یعنی) پاک اور بلند ہے اللہ کی ذات (ان جیسی ادنیٰ چیزوں سے)۔ وہ تو بے نیاز ہے (یعنی) اس کو کسی چیز کی ضرورت نہیں (اس لئے کہ) اس کا تو ہے جو کچھ بھی کہ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ بھی کہ زمین میں ہے۔ (پھر اسے بیٹا بنا لینے کی کیا ضرورت ہے؟ جبکہ سب کچھ تو اس کا ہے) آخر تمہارے پاس اس (بکواس) کی

کوئی دلیل بھی ہے؟ کیا تم اللہ کے بارے میں ایسی ایسی (بے سروپا) باتیں کہتے ہو جو تم جانتے تک نہیں۔(۶۸) آپ فرمادیں کہ حقیقتاً" جو لوگ اللہ پر جھوٹی تہمتیں گھڑتے ہیں' وہ کبھی کوئی حقیقی یا بھرپور کامیابی حاصل نہیں کر سکتے۔(۶۹)(یہ اور بات ہے کہ وہ) دنیا میں تھوڑا سا وقتی فائدہ اٹھالیں' پھر تو ان کو ہماری ہی طرف پلٹنا ہے' پھر ہم ان کو ان کے انکار کرنے کے بدلے میں (اپنی) سزا کا مزہ چکھائیں گے"۔(۷۰)(سورۂ یونس ۱۰' آیات ۶۶-۷۰)

تشریح :

محققین نے ان آیتوں سے نتیجے نکالے۔ (۱)خدا نے جہاں جہاں اپنی ذات کے وجود کے بارے میں عقلی محکم دلیلیں دی ہیں وہاں اتمام حجت کے لے ملحدوں اور مشرکوں سے بھی عقلی دلیلوں کا مطالبہ کیا ہے اس سے معلوم ہوا کہ خدا کے نزدیک عقل ہی آخری حجّت ہے۔

(۲) اہل عرفان نے نتیجہ نکالا کہ پوری رات نماز اور ذکر میں مشغول نہیں رہنا چاہئے بلکہ سونا بھی ضروری ہے۔ اسی میں مصلحت بھی ہے' ادب بھی اور حکم خدا کی تعمیل بھی۔

(۳) ساری کائنات کا خدا سے تعلق مخلوقیت اور مملوکیت کا ہے۔ خدا سے کسی کا رشتہ داری کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

(۴) خدا کا فرمانا کہ اسے کسی چیز کی احتیاج نہیں' بتاتا ہے کہ اسے بیٹے کی بھی کوئی ضرورت نہیں۔ پوری کائنات کا حقیقی مالک ہونا' کسی کے باپ ہونے سے کہیں زیادہ بامعنی اور مضبوط ہے۔ انسانوں اور دیوتاؤں کو اپنی بقا اور اپنے ارمان پورے کرنے کے لئے اولاد کی ضرورت ہوتی ہے خدا تو ایسے ارمانوں کا خالق ہے اس لئے وہ ایسے ارمانوں کا محتاج نہیں۔

انسان کی فطرت میں یہ تجسّس ہے کہ وہ یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ مظاہر کائنات کے پیچھے کون سی حقیقت کارفرما ہے۔ ہم جائزہ لے کر دیکھتے ہیں کہ دنیا میں مختلف گروہوں نے اس تجسّس کے کون کون سے طریقے اختیار کئے۔

(۱) مشرکین نے تو صرف وہم پرستی اور باپ دادا کی تقلید پر اپنی فکر کی بنیاد رکھی۔

(۲) اشراقیوں اور جوگیوں نے مراقبہ کا ڈھونگ رچایا اور دعویٰ کیا کہ ہم ظاہر کے پیچھے سے جھانک کر باطن کا مشاہدہ کرلیتے ہیں مگر حقیقتاً" انہوں نے اپنی سراغ رسانی کی بنیاد بھی وہم و گمان پر رکھی۔ اصل میں وہ اپنے گمان ہی کا مراقبہ کرتے ہیں اور وہ جو کچھ دیکھتے ہیں وہ اصل میں انکا وہ گمان ہوتا ہے جو انہوں نے قائم کرلیا ہے۔ اس گمان کو ذہن میں جمادینے کے بعد ذہن پر دباؤ ڈالنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کا وہی خیال یا گمان چلتا پھرتا نظر آنے لگتا ہے۔

(۳) اصلاحی فلسفیوں نے اپنے قیاس کو تحقیق کی بنیاد بنایا۔ مگر اپنے گمان کے لنگڑے پن کو محسوس کرکے انہوں نے منطقی استدلال اور مصنوعی تعقل کی بیساکھیوں کا سہارا لیا اور اس کا نام قیاس رکھ دیا۔

(۴) سائنس دانوں نے اگرچہ سائنس کے دائرے میں تحقیقات کے لئے علمی طریقہ اختیار کیا مگر مابعد الطبیعات کے حدود میں قدم رکھتے ہی وہ عملی طریقے کو چھوڑ کر قیاس وگمان، اندازے اور تخمینے کے پیچھے چل پڑے۔ مزید یہ ہوا کہ ان سب گروہوں کو تعصب کی بیماری لگ گئی جس کی وجہ سے وہ ایک دوسرے کی بات سننے کو تیار نہ ہوئے۔

(۵) قرآن نے اول تو ان چاروں تجسّس کے طریقہ کو غلط قرار دیا قرآن نے کہا کہ تم لوگوں کی گمراہی کا اصل سبب یہی ہے کہ تم حقیقت کی تلاش کی بنیاد گمان اور قیاس آرائی پر رکھتے ہو اور پھر تعصب کی وجہ سے کسی کی معقول بات سننے کو تیار نہیں ہوتے۔ ایسی دہری غلطی کا نتیجہ یہ ہے کہ تم حقیقت کو پا نہیں سکتے۔

قرآن نے تحقیق کا صحیح علمی طریقہ یہ بتایا ہے کہ پہلے تم انبیاءؑ کا بیان کھلے دلوں اور کانوں سے بلا تعصب سنو۔ پھر کائنات میں جو آثار و آیات کے دلائل اور نشانیاں تمہارے مشاہدے اور تجربے میں آتے ہیں، ان پر غور و فکر کرو۔ ان شہادتوں کو مرتب کرکے دیکھو۔ اس طرح تلاش کرتے چلے جاؤ کہ اس ظاہر کے پیچھے جس حقیقت کی نشاندہی انبیاء کرامؑ کر رہے

ہیں' ان کی طرف اشارہ کرنے والی علامات تم کو اس ظاہر میں ملتی ہیں یا نہیں؟ اگر تمہیں ایسی علامات نظر آئیں اور ان کے اشارے بھی واضح ہوں تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ تم خوامخواہ انبیاءؑ کے پیغام کو جھٹلاؤ۔ جبکہ ان کا بیان ظاہری آثار اور علمی شہادتوں کے عین مطابق ہے۔ یہی طریقہ فلسفہ اسلام کی بنیاد ہے۔

مثلاً اس آیت میں دو آثار کی طرف توجہ دلائی گئی ہے یعنی رات اور دن۔ یہ دونوں زمین کی باقاعدہ منضبط گردش کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ انضباط اور زمین اور سورج کا تعلق (Co-relation) ایک غالب حاکم کے وجود کی صریح علامت ہے۔ (اگر بجلی کا آنا' بجلی پیدا کرنے کے کارخانہ کے وجود کا ثبوت ہے تو سورج کا نکلنا ڈوبنا اس کے خالق کا ثبوت کیوں نہیں ہوتا) رات دن کے پیدا ہونے سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ جس ذات نے زمین پر موجودات پیدا کی ہیں' وہ خود ہی ان کی ضروریات بھی فراہم کرتا ہے۔ اس لئے محسن اور مربی ہونے کی حیثیت سے وہی بندگی اور اطاعت کے لائق ہے۔ غرض ان آثار' شہادتوں کے مقابلے میں مشرکوں' کافروں اور فلسفیوں کے وہم وگمان' قیاس اور تخمینے کس طرح صحیح ہوسکتے ہیں؟ بقول شاعر۔

فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں
ڈور کو سلجھا رہا ہے پر سرا ملتا نہیں

غرض قرآن کا پیغام یہ ہے کہ مذہبی فکر کی بنیاد علم پر رکھی جائے۔ مظاہر قدرت و حکمت پر رکھی جائے۔ وہم وگمان پر جو عمارت کھڑی کی جائے گی وہ مضبوط نہیں ہو سکتی۔ بقول ڈاکٹر اقبال۔

عقل آوارہ امامت کی سزاوار نہیں
راہبر ہوں، ظن و تخمیں تو زبوں کار حیات

اکثر اہل مذہب جس مذہب کو اختیار کیے جا رہے ہیں اس کی کوئی علمی دلیل نہیں ہوتی وہ صرف اپنے وہم وگمان کی بنیاد پر فرشتوں، جنوں، بادشاہوں، سرمایہ داروں کو خدا کا شریک بنا لیتے ہیں یا انبیاءؑ کو خدا کا بیٹا بنا لیتے ہیں۔ (ملخص از تفہیم)

خدا کی معرفت کے سلسلے میں ہمیں یہاں پر یہ بتایا گیا ہے کہ

۱۔ اللہ کی ذات بے عیب ہے۔

۲۔ خدا کی ذات بے نیاز ہے اس کو کسی چیز کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس لئے اس کو بیٹا بنانے کی کوئی ضرورت نہیں۔

۳۔ زمین اور آسمان کی تمام موجودات خدا کی ملکیت اور تخلیق ہیں۔

۴۔ خدا نے یہ کائنات عمل کے امتحان کے لئے بنائی ہے جس کا لازمی منطقی نتیجہ جزا اور سزا ہے۔

۵۔ ہر شخص کو دنیا میں آکر خدا کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔

قانون جزا کی حکمت

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جزاء اور سزا کا مقصد خدا کا جذبہ انتقام ہے۔ لیکن یہ غلط خیال ہے۔ ہماری جزاء سزا باہر سے نہیں آتی بلکہ انسان کی فطرت کے قوانین سے خود بخود پیدا ہوتی ہے۔ ان قوانین کو خدا نے ہی بنایا ہے مگر ان کا مقصد انتقام لینا نہیں بلکہ انسان کی تربیت ترقی اور امتحان ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ انسان کی خود شعوری صرف ایک ہی خواہش رکھتی ہے اور وہ خواہش یہ ہے کہ منبع حسن وکمال یعنی خدا کا قرب اور اسکی رضامندی حاصل کرے۔ ہماری خودشعوری کی تمام مسرتوں اور راحتوں کا دارومدار اس کی اسی خواہش کی تکمیل پر ہوتا ہے اور اس کے دکھوں اور غموں کا باعث یہ ہوتا ہے کہ اس کی یہ خواہش تکمیل نہیں پاتی۔ لہٰذا خود شعوری کی جنت خدا کی رضامندی کا قرب ہے۔ اور اس کی دوزخ خدا کی رضامندی سے دوری ہے۔ اس لئے جنت کی سب سے بڑی نعمت یہ ہے کہ خود خدا اس کو یقین دلاتا ہے کہ وہ اس انسان سے راضی ہے کیونکہ انسان کی خودشعوری اس کے سوا کچھ نہیں چاہتی۔ اسی لئے جنتی انسان کو مرتے وقت خدا کی طرف سے یہ خوشخبری سنائی جاتی ہے۔

"اے مطمئن جان! اپنے پالنے والے ملک کی طرف لوٹ جا۔ وہ تجھ سے راضی ہے اور تو اس سے راضی ہے۔ میرے (خاص) بندوں میں شامل ہوجا اور میری جنت میں داخل ہوجا۔"

پھر خدا نے فرمایا۔

"(اہل جنت کے لئے) اللہ کی رضامندی سب سے بڑی چیز ہوگی۔ کاش کہ یہ بات لوگ جان لیں۔"

ان آیتوں سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ جنت اور دوزخ کی ابتدا دنیا ہی میں ہوجاتی ہے۔ جو شخص دنیا میں خدا کی رضامندی اور محبت کو حاصل کرنے سے اندھا بنا رہتا ہے وہ اگلی دنیا میں بھی اندھا ہوتا ہے۔ خدا نے فرمایا۔

"جو شخص یہاں (اس دنیا میں) اندھا ہوگا' وہ آخرت میں بھی اندھا اور راہ گم کردہ ہوگا۔"

عمل کی حقیقت

انسان کا ہر عمل اصل میں اس کی خودشعوری کا عمل ہوتا ہے' جسم کا نہیں۔ خودشعوری جسم کو عمل کے آلے کے طور پر استعمال کرتی ہے۔ لہٰذا ہر عمل حقیقت میں ایک ذہنی کیفیت کا نام ہے اور ہر ذہنی کیفیت یا تو خودشعوری کو محبوب حقیقی یعنی خدا سے قریب لاتی ہے اور لے جاتی ہے اسی لئے وہ یا تو ہماری خودشعوری کو راحت پہنچاتی ہے یا تکلیف۔ اس لئے ہر زندگی یا تو جنت ہوتی ہے یا دوزخ۔ گناہ کی زندگی وہ زندگی ہے جو خدا سے قرب کی رکاوٹوں میں گھر جاتی ہے اس لئے اپنی منزل مقصود تک ارتقا نہیں کرسکتی۔ جو خود شعوری ان گناہوں کی رکاوٹ کو دنیا میں ہٹاکر

نیکیوں کی طرف بڑھ جاتی ہے' وہ زندگی ہی میں ارتقا کی منزلیں طے کرلیتی ہے لیکن اگر خودشعوری کو دنیا میں یہ موقع نہیں ملتا تو یہ جدوجہد اگلی دنیا میں جاری رہتی ہے۔ اس وقت یہ جدوجہد دوزخ برزخی میں انجام پاتی ہے۔ اس لئے خود شعوری اس ارتقاء کی جدوجہد کو ملتوی تو کرسکتی ہے' لیکن اس سے بچ نہیں سکتی۔ لیکن ملتوی کرنے پر اسے سخت تکلیف اٹھانی پڑتی ہے۔ متواتر گناہ کرنے والا محسوس کرتا ہے کہ نیکی کی زندگی کی طرف لوٹنا اس کے لئے دن بدن مشکل تر ہوتا جاتا ہے۔ آخرکار اس کی خودشعوری اور نیکی کے درمیان ایسی رکاوٹ حائل ہوجاتی ہے جسے عبور کرنا اس کے لئے ممکن نہیں ہوتا اس لئے خدا نے فرمایا۔

"اس میں کوئی شک نہیں کہ توبہ (یعنی) خدا کی طرف لوٹنا صرف ان لوگوں کے لئے ممکن ہے جو (خدا سے بغاوت کی وجہ سے نہیں بلکہ) نہ جاننے کی غلطی کی وجہ سے گناہ کرتے ہیں اور پھر جلدی سے گناہ کی زندگی سے واپس لوٹ آتے ہیں۔"

نیز خدا نے فرمایا۔

"(خدا کے بندے تو وہ ہوتے ہیں کہ) جب کسی بے حیائی کا کام کرکے اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں تو پھر اپنے برے کام پر دانستہ اصرار نہیں کرتے۔ (یعنی اسکو دوبارہ نہیں انجام دیتے)"

انسان کی سب سے بڑی ناکامی اور شکست یہ ہوتی ہے کہ وہ دنیا میں

گناہ کی رکاوٹوں کے خلاف جدوجہد میں کامیاب نہ ہوسکے۔ کیونکہ اگلی دنیا میں گناہوں کے ازالے کے لئے اسے بہت زیادہ سخت دکھ اور رنج اٹھانا پڑے گا۔ یہ لوگ موت کے بعد دوزخ سے اپنا ارتقاء شروع کریں گے۔ یہ دوزخ دنیا میں اسے جنت معلوم ہوتا ہے لیکن خودشعوری اپنے دوزخ کی پوری شدت کا سامنا اس وقت کرتی ہے جب خدا سے دوری کی حالت میں اس کی زندگی ختم ہوجائے۔ اور اس کیفیت کو لے کر وہ دوسری دنیا میں پہنچ جائے۔ اس وقت خودشعوری پر رنج و غم اور تکلیف کی بدترین کیفیت طاری ہوتی ہے۔ اس لئے کہ اب وہاں اسے کوئی غلط فہمی نہیں ہوسکتی تمام غلط نصب العین' خدا کے جھوٹے جانشین اور دعویدار' شیطان کا تزئین اعمال کا عمل سب ختم ہوچکا ہوتا ہے' تمام جھوٹی تسلیاں یک قلم موقوف ہوچکی ہوتی ہیں۔ خدا نے فرمایا۔

"انہوں نے (مرتے میں) عذاب کو اپنے سامنے دیکھ لیا اور (غلط فہمی کے) تمام اسباب ان سے کٹ گئے۔"

"اور جھوٹ جو انہوں نے گھڑلیا تھا' ان سے غائب ہوگیا" (القرآن)

ایسے انسان کو شدید ذہنی تکلیف کی وجہ سے بالکل ایسا محسوس ہوگا کہ جیسے وہ جلتی آگ میں جھونک دیا گیا۔ کیونکہ اگلی دنیا میں انسان کی ہر ذہنی کیفیت ایک خارجی حقیقت کی صورت اختیار کرلیتی ہے جس طرح دنیا میں خارجی حقیقت ایک ذہنی کیفیت کی صورت اختیار کرلیتی ہے۔

لیکن مومن جو ہر وقت خدا کی محبت اور اطاعت کی کوششوں میں لگا رہتا ہے' اور خدا کی محبت کو دنیاداری کی ناپاک محبتوں سے دبنے نہیں دیتا اور اسی وجہ سے گناہ کی رکاوٹوں اور امتحانوں پر قابو پائے رہتا ہے تو اس کی خدا سے محبت بڑھتی جاتی ہے۔ اور جب اس کی خودشعوری موت کا ذائقہ چکھ کر اگلی دنیا میں پہنچ جاتی ہے تو خدا کی محبت کے راستے کی تمام مشکلیں اور رکاوٹیں ختم ہوچکی ہوتی ہیں۔ اس لئے اس کی مسرت ایسے کمال کو پہنچ جاتی ہے جس کا تصور کرنا ممکن نہیں۔ خدا فرماتا ہے۔ "کوئی جان نہیں جان سکی کہ کیسی کیسی آنکھوں کی ٹھنڈک (کا سامان) اس کے لئے وہاں مہیا کیا گیا ہے۔"

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا "جنت میں وہ مسرتیں لذتیں اور نعمتیں ہوں گی کہ نہ کسی کان نے سنیں اور نہ کسی انسان کے دل نے اس کا تصور کیا۔"

اس لئے موت کے وقت خدا کا سچا عاشق انتہائی مسرت کی ایسی جھلک پاتا ہے کہ وہ خوشی سے سراسر بھر جاتا ہے۔ اس کے چہرے پر اطمینان اور راحت کی ایک کیفیت نمودار ہوجاتی ہے۔ بعض اوقات چہرے پر ہلکا سا تبسم کھیلنے لگتا ہے۔ پھر اس کی مسرت اور اس کا ارتقاء بغیر کسی جدوجہد کے خود بخود ہمیشہ جاری رہتا ہے یہی وہ مسرت ہے کہ جس کے حاصل ہونے کے بعد پھر اسے کسی چیز کی تمنا باقی نہیں رہتی۔ وہ ہمیشہ محبوب حقیقی کے

حسن اور عطاؤں کی تازہ بہ تازہ' نو بہ نو جھلک سے لطف اندوز ہوتا رہتا ہے۔ ہر قدم اس کو اور اگلا قدم اٹھانے کی استعداد از خود بہم پہنچاتا ہے۔ یہ ارتقاء مسلسل جاری و ساری رہتا ہے۔

برکلے' ہیگل' کروچے' جیٹلے جیسے عظیم فلسفی اور ایڈنگٹن جیسے سائنس دانوں نے لکھا کہ دنیا میں اگر کسی چیز کی موجودگی کا ہمیں یقین ہو سکتا ہے تو وہ ہماری ذہنی کیفیتیں ہیں۔ اس طرح اگلی دنیا میں بھی ہماری ذہنی کیفیتوں کے سوا کوئی چیز فی الحقیقت موجود نہیں ہوگی۔ اس لئے اگلی زندگی ہماری اپنی ذہنی کیفیتیوں کی تصویر ہوگی۔ یعنی اگلی دنیا میں ہماری خود شعوری اپنی ذہنی کیفیتوں کو خارجی شکل دے گی اور ایسا کرتے ہوئے ان اشیاء کو کام میں لائے گی جو اس دنیا میں اس کے تجربہ میں آچکی ہوں گی۔ خدا فرماتا ہے۔

"اہل جنت کہیں گے کہ یہ تو وہی نعمتیں ہیں جو ہمیں دنیا میں بھی دی گئی تھیں۔ حقیقت میں وہ نعمتیں دنیا کی نعمتوں سے ملتی جلتی ہوں گی"۔(قرآن)

جس طرح ہم سوتے ہوئے خواب میں اپنی ذہنی کیفیت کی وجہ سے دیکھتے' سنتے' چھوتے' سونگھتے' سوچتے' حرکت کرتے' جانتے اور محسوس کرتے ہیں' جبکہ ہمارا جسم بے حس و حرکت پڑا ہوتا ہے اور ہمارے ظاہری قوئ موقوف ہو چکے ہوتے ہیں۔ اسی طرح موت کے بعد ہمارے

ظاہری قوی ہم سے الگ ہوجائیں گے لیکن ہم اپنی ذہنی کیفیت میں دیکھیں گے' سنیں گے' محسوس کریں گے' حرکت کریں گے' سوچیں گے اور جانے پہچانیں گے' اگلی دنیا میں ہماری ذہنی کیفیتیں خارجی وجود اختیار کرلیں گی اور وہ تمام چیزیں دنیا کی چیزوں سے کہیں زیادہ اصلی اور ٹھوس ہوں گی اس لئے کہ دنیا کی چیزیں بھی ہمارے ذہن سے الگ کوئی وجود نہیں رکھتیں۔ خواب کی مثال ایک ادھوری مثال ہے۔(قرآن اور علم جدید)

مگر یہ حقیقت ہے کہ مرنے کے بعد ہر خودشعوری ایک الگ دنیا میں ہوگی جسے وہ اپنی ذہنی کیفیتوں سے خود تعمیر کرے گی۔ ہر خود شعوری ایک مختلف جنت یا دوزخ میں داخل ہوگی۔ یہ جنت اور دوزخ وہی ہوگی جو اس نے اپنی دنیا کی زندگی میں اپنے لئے تیار کی ہوگی۔ ہر خود شعوری کے دوزخ کا درجہ حرارت مختلف ہوگا۔ ہر خود شعوری کے حور و غلمان کا حسن و جمال' محبت اور الفت کی کیفیت خودشعوری کے مقام محبت الٰہی پر موقوف ہوگی اور اس کی محبت کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ بدلتی چلی جائے گی کیونکہ مرنے کے بعد ہماری جنت یا دوزخ خودشعوری کی ذہنی کیفیتوں سے پیدا ہو گی اس لئے جیسے جیسے ہماری ذہنی کیفیتیں اپنے تکلیف دہ عناصر کو کھوتی جائیں گی ان کے دوزخ کا درجہ حرارت کم ہوتا چلا جائے گا اور ان کی جنت کی مسرتیں ازخود بڑھتی چلی جائیں گی۔ بقول اقبال۔

ترا جہاں ہے وہی جس کو تو کرے پیدا
یہ سنگ خشت نہیں جو تیری نگاہ میں ہیں

خدا کو ماننے کا نتیجہ

(قرآن)

"آپؐ نرمی کرنے اور معاف کرنے کا طریقہ اختیار کیجئے۔ اچھے کاموں کی تلقین و ترغیب دیجئے اور جاہلوں (یعنی حق کے دشمنوں) کی طرف سے بے توجہی فرمایئے۔(۱۹۹) اور اگر کبھی شیطان آپؐ کو بھڑکانے کی کوشش کرے تو اللہ سے پناہ مانگئے۔ حقیقتاً" وہ بڑا سننے والا' اور سب کچھ جاننے والا ہے۔(۲۰۰) حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ برائیوں سے بچتے ہوئے' خدا کے عائد کئے ہوئے فرائض کو ادا کرتے رہتے ہیں' انہیں جب کبھی شیطان کی طرف کا کوئی خیال پیدا ہوتا ہے' تو وہ فوراً ہوشیار ہو جاتے ہیں اور پھر انہیں صاف صاف نظر آنے لگتا ہے کہ ان کے لئے صحیح طریقہ کار کیا ہے۔(۲۰۱) شیطانوں کے بھائی انہیں گمراہی کی طرف کھینچے ہی چلے جاتے ہیں' اور انہیں گمراہ کرنے میں کوئی کمی نہیں کرتے۔(۲۰۲) اور جب تک آپؐ ان کے سامنے کوئی دلیل یا نشانی پیش نہیں کرتے' اس وقت تک تو یہ لوگ یہی کہتے رہتے ہیں کہ آخر آپؐ نے (اپنے کو سچا ثابت کرنے کے لئے) کوئی معجزہ کیوں نہ

منتخب کیا؟ آپؐ ان سے کہئے میں تو صرف خدا کے پیغام کی پیروی کرتا ہوں جو میرے پاس میرے پالنے والے مالک کی طرف سے بھیجا جاتا ہے اور یہ (قرآن) تمہارے پالنے والے مالک کی طرف سے کھلی ہوئی نشانیاں' بصیرت کی روشنیاں' سراسر ہدایت اور رحمت ہے۔ ان لوگوں کے لئے جو اسے دل سے مانیں اور قبول کریں۔(۲۰۳) اور جب قرآن تمہارے سامنے پڑھا جائے تو اسے پوری توجہ سے سنو اور خاموش رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔(۲۰۴) اور صبح وشام اپنے پالنے والے مالک کو دل ہی دل میں عاجزی کے ساتھ ڈرتے ڈرتے یاد کرتے رہو۔ ایسی آواز میں جو حد سے زیادہ اونچی نہ ہو (تاکہ) تم غفلت کرنے والے بے خبروں میں سے نہ ہوجاؤ۔(۲۰۵) حقیقت یہ ہے کہ جو فرشتے تمہارے پالنے والے مالک کے نزدیک ہیں (یا) اس کی بارگاہ میں قربِ کا مقام رکھتے ہیں' وہ کبھی اس کی بندگی یا عبادت سے تکبر نہیں کرتے۔ وہ اس کی پاکی بیان کرتے رہتے ہیں اور اس کے آگے سجدہ میں جھکے رہتے ہیں۔(۲۰۶) سجدہ کیجئے۔" (سورۂ اعراف۔ آیت ۱۹۹ سے ۲۰۶)

تشریح :

اس آیت سے معلوم ہوا کہ جو لوگ خدا کو دل سے مانتے ہیں وہ خدا کے حوالے سے ساری مخلوق کو دیکھتے ہیں۔ یعنی سب کو خدا کی مخلوق سمجھتے ہیں اس لئے وہ نرمی کا رویہ اختیار کرتے ہیں۔ (۲)لوگوں کی غلطیاں اس لئے بھی معاف کرتے ہیں تاکہ خدا ان کی غلطیاں معاف کردے اور تاکہ ان کو اس کا اجر عظیم عطا فرمائے۔ (۳) اگر شیطان ان کو بھڑکاتا ہے کہ دوسروں کا حق مار کر اپنا فائدہ حاصل کرلو، تو وہ ایسا برا کام کرنے سے خدا کی پناہ مانگتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ یہ جانتے ہیں کہ انہیں بالآخر خدا کے سامنے حاضر ہونا ہے۔ (۴)خدا کو ماننے والے لوگ خدا کے حکم کی وجہ سے ہر قسم کی برائی سے بچتے ہیں اور خدا کے حکم پر خدا اور خدا کی مخلوق کے حقوق ادا کرنا اپنا اولین فریضہ سمجھتے ہیں۔ (۵)اگر کبھی کسی غلط خیال کے زیر اثر آبھی جاتے ہیں تو جلدی سے ہوشیار ہوجاتے ہیں اور غلط قسم کے خیالات کو دل ودماغ سے جھٹک دیتے ہیں اور ان کے اس عمل کی وجہ سے خدا ان کو سیدھا راستہ اور صحیح طریقہ کار دکھا دیتا ہے۔ (۶)جو لوگ خدا کو نہیں مانتے، ان کو شیاطین گمراہی کے اندھیروں میں کھینچے ہی لئے جاتے ہیں اور اس طرح وہ بڑے بڑے گناہوں میں مبتلا ہوتے چلے جاتے ہیں۔ (۷)خدا کا ماننے والا خدا کے حکم کی پیروی کرتا ہے۔ جس کی وجہ سے اس کی زندگی میں ایک انضباط (Disipline) اور ارتباط پیدا ہوجاتا

ہے۔ زندگی بامعنی اور اعلیٰ مقاصد کے لئے وقف ہوجاتی ہے۔ وہ قرآن اور حقیقت پر مبنی ہر بات کو غور سے سنتا اور سمجھتا ہے۔ وہ صرف مادہ پرست ہوکر ذاتی منفعتوں کا غلام نہیں بن جاتا۔ (۸) خدا کو دل سے ماننے والا صبح وشام خدا کو یاد کرتا رہتا ہے اس طرح اس میں ایک قسم کا خاص شعور اور طرز عمل پیدا ہوجاتا ہے۔ جو نہایت پاک اور اعلیٰ مقاصد کی ترجمانی کرتا ہے جس سے اس کے دل میں عاجزی اور خدا کا خوف پیدا ہوجاتا ہے جو اسے ہر قسم کے ظلم، زیادتی اور برائی سے روک دیتا ہے۔ (۹) اس کے قول و عمل، رفتار وگفتار میں بلا کا اعتدال اور توازن پیدا ہوجاتا ہے۔ (۱۰) وہ ایک ہوشیار انسان کی طرح حق کا طلبگار ہوتا ہے۔ حق کی تلاش اور جستجو اس کی زندگی کا مقصد ہوتا ہے۔ وہ مادی لذتوں کے پیچھے دیوانہ ہوکر اس کے لئے اپنی زندگی کو وقف نہیں کردیا کرتا۔ (۱۱) وہ اپنی دولت، قوت، علم، عمل حتیٰ کہ خدا کے قرب کے حاصل کرلینے کے بعد بھی متکبر نہیں ہوتا کیونکہ خدا کی عظمت ہمیشہ اس کے پیش نظر رہتی ہے۔ بقول میرانیس۔

عزت جسے دیتا ہے خدا دیتا ہے
وہ دل میں فروتنی کو جا دیتا ہے

کرتے ہیں تہی مغز ثنا آپ اپنی
جو ظرف کہ خالی ہو، صدا دیتا ہے

جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا کہ جبریلؑ نے مجھ سے کہا "خدا آپ کو حکم دیتا ہے کہ جو شخص آپ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم پر ظلم کرے، اسے معاف کردیا کیجئے اور جو کوئی آپ کو محروم کرے آپؐ آپ اسے عطا کیجئے۔ اور جو آپؐ سے قطع رحم یعنی قطع تعلق کرے آپؐ اس سے صلہ رحمی یعنی رحم وکرم کا سلوک کیا کیجئے"۔(تفسیر صافی ۱۸۸ بحوالہ مجمع البیان)

شیطان کے بھڑکانے سے مراد سخت غصہ، اشتعال، بھڑک جانا جو جاہلوں، حق کے منکروں، ضدی قسم کے لوگوں کا طریقہ کار ہوا کرتا ہے۔ جب خدا کے ماننے والوں کے اندر اس قسم کے جذبات پیدا ہونا شروع ہوتے ہیں تو وہ سمجھ جاتے ہیں کہ شیطان ان کو بھڑکا رہا ہے۔ تو وہ فوراً خدا سے پناہ مانگنے لگتے ہیں۔ یعنی دعا استغفار، تلاوت قرآن اور غور وفکر کے ذریعہ خدا کی عظمت کو اپنے سامنے لے آتے ہیں۔

محققین نے لکھا کہ رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا کافروں کے مطالبہ پر یہ کہنا کہ "میں تو صرف خدا کے پیغام کی پیروی کرنے والا ہوں۔" یہ بتاتا ہے کہ غیبی امور اور خدا کے معاملات پر اختیار حاصل ہونا عبدیت نہیں، بلکہ کمال عبدیت پیرویٔ وحی پر منحصر ہے۔

خدا کو دل ہی دل میں یاد کرتے رہنے کے حکم سے معلوم ہوا کہ خدا کی یاد کرنے کی اعلیٰ قسم یہ ذکر بھی ہے کہ جس میں زبان کو مطلق حرکت

نہیں ہوتی، مگر دل ہی دل میں خدا کی قدرت، رحمت، نعمت، عظمت، عطا اور احسانات کا احساس کروٹ لیتا رہتا ہے۔ اس کو ذکر حق کہتے ہیں۔ حدیث قدسی میں ہے کہ خدا فرماتا ہے کہ "جو شخص اپنی تنہائیوں میں اپنے دل کی گہرائیوں میں مجھے یاد کرتا ہے، تو میں بھی اسے اپنی تنہائیوں میں یاد کرتا ہوں۔" عرفاء نے لکھا ہے بندے کے لئے یہ مقام ناقابل حد تک بلند ہے۔

آیت کا پیغام یہ ہے کہ جب فرشتے جو گناہوں اور غفلتوں سے پاک ہیں، پھر بھی خدا کی تسبیح اور عبادت میں ہر وقت لگے رہتے ہیں تو انسان کو تو اپنے گناہوں اور غفلتوں کے سبب زیادہ سرگرمی کے ساتھ عبادت اور تسبیح میں مصروف رہنا چاہئے۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے کہ جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا۔ "تسبیح اللہ کے اسماء میں سے ایک اسم ہے اور یہ جنتیوں کی دعا ہے۔" (تفسیر عیاشی)

مفسرین نے لکھا ہے کہ جنتیوں کی جنت میں یہ دعا ہوگی کہ "اے اللہ! ہم کو اس بات کی توفیق عطا فرما کہ ہم تیری ایسی پاکی بیان کرسکیں جو تیرا حق ہے۔" (تفسیر صافی ص ۳۲۰)

شیطانی خیالات کا پیدا ہونا

جدید نفسیات کی تحقیقات نے ہم کو بتایا ہے کہ انسان کا لاشعور حسن

وکمال کا طالب ہے اور اس کی یہ خواہش نہایت تیز اور طاقتور ہے۔ لیکن کیونکہ لاشعور کا بیرونی دنیا سے براہ راست کوئی تعلق نہیں اس لئے لاشعور نہیں جانتا کہ بیرونی دنیا میں اس کی اس طلب حسن وکمال کی خواہش کس طرح پوری ہوسکتی ہے۔ لاشعور' شعور کو جو اسی کا ایک حصہ ہے' اور دنیا کو دیکھنے اور کام میں لانے کے لئے سطح شعور سے اوپر نمودار ہوگیا ہے' لاشعور کے خادم کی حیثیت سے کام کرتا ہے کیونکہ لاشعور نے شعور یا ایگو کو یہ کام دے رکھا ہے کہ وہ حسن وکمال کو تلاش کرے تاکہ لاشعور کا جذبہ حسن مطمئن ہوسکے۔ ایگو یا شعور اندازہ لگاتا ہے کہ لاشعور کس حسن کا طالب ہے۔ شعور کے یہی اندازے تصورات' نظریات یا آدرش کہلاتے ہیں۔ اپنے فرض کی انجام دہی کے لئے انسانی شعور نے جو کوششیں کی ہیں' انسان کی پوری تاریخ انہیں کی داستان ہے۔ ہمارا شعور ہمارے لاشعور کے مقصود کی تلاش میں ہر وقت مصروف رہتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس خدمت کے لئے اسے ایک بہت بڑے انعام ملنے کی توقع ہوتی ہے۔ وہ انعام لاشعور کی دوستی اور محبت ہے۔ اس طرح شعور لاشعور کی بے پناہ قوت اور طاقت میں حصہ دار بن جاتا ہے اور اس کی اپنی طاقت اور قوت بڑھ جاتی ہے اور اس کو بے اندازہ خوشی اور طاقت حاصل ہوتی ہے۔

ایگو کی غلطیاں

ایگو یا ہمارا شعور صرف اتنا جانتا ہے کہ لاشعور جس چیز کو چاہتا ہے وہ نہایت عمدہ اور اعلیٰ ہے۔ اس سے بہتر کوئی چیز موجود نہیں۔ اس محدود واقفیت سے آغاز کرنے کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہمارا شعور (ایگو) بار بار غلطیاں کرتا ہے۔ اس کی پہلی غلطی وہی ہے جسے فرائیڈ نے آبائی الجھاؤ کہا ہے۔ ایگو والدین کو حسن وکمال کی انتہا سمجھ لیتا ہے۔ چند سال یہ غلطی خوب کامیاب رہتی ہے لیکن جب بیرونی دنیا سے متعلق ایگو کا علم وسیع تر ہوجاتا ہے تو وہ لاشعور کی خواہش کی بہتر ترجمانی کے قابل ہوجاتا ہے۔ اب اسے ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ والدین کے تصور سے بہتر تصورات بھی دنیا میں موجود ہیں۔ اب والدین کا تصور اس کے لاشعور کو مطمئن نہیں کرسکتا۔ اب شعور' لاشعور کے سامنے اور تصورات پیش کرتا ہے۔ اکثر اوقات یہ تصورات ایسے ہوتے ہیں جن میں حسن وکمال "حقیقتاً" موجود ہی نہیں ہوتا۔ ہمارا شعور غلطی سے حسن وکمال کو ان کی طرف منسوب کردیتا ہے۔ آخرکار یہ تصورات لاشعور کو مطمئن نہیں کرسکتے۔ شرک کی بنیاد یہی غلطی ہوتی ہے۔ انسان کی تمام مصیبتیں اور دنیا کی تمام برائیاں ایگو یا شعور کی انہیں غلطیوں سے پیدا ہوتی ہیں۔

جب شعور اور لاشعور کے درمیان کھچاؤ پیدا ہوتا ہے تو اعصابی خلل پیدا ہوجاتا ہے۔ اس اعصابی خلل کو دور کرنے کا بہترین طریقہ کار یہ ہے

کہ انسان فوراً اللہ کے سامنے سچے دل سے توبہ کرے۔ اپنی غلطیوں کا اعتراف کرے۔ نہایت اخلاص کے ساتھ خدا کی عبادت اور اطاعت کی طرف رجوع کرے اور تمام ایسے افعال سے جو طلب حسن وکمال کے منافی ہوں' سختی سے بچتا رہے۔ اگر وہ ایسا کرے گا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ لاشعور کے اصل مقصود اور مطلوب کی طرف لوٹ رہا ہے۔ اس طرح شعور' فوق الشعور سے یعنی لاشعور کی غلط ترجمانی سے الگ ہوجائے گا۔ لاشعور کو بے پناہ اطمینان اور تسلی حاصل ہوجائے گی اور وہ شعور سے صلح کرلے گا۔

سچی توبہ اور مخلصانہ عبادت خدا کی شدید محبت کے بغیر ممکن نہیں۔ یہ محبت خدا پر ایمان سے آغاز کرکے عبادت کے سبب ترقی پاتی ہے۔ اسی لئے عبادت (ذکر) کی عادت بنانا اعصابی امراض سے انسان کو محفوظ رکھتا ہے۔ جوں ہی شعور خدا کی عبادت کرنے لگتا ہے تو وہ صحیح سمت پر حسن وکمال کی تلاش میں چل نکلتا ہے۔ اس طرح شعور لاشعور کی صحیح خدمت انجام دیتا ہے؛ شعور کی شکایات جو ذہنی مجادلے اور اعصابی الجھاؤ کی شکل اختیار کرتی ہیں' دور ہوجاتی ہیں۔ شعور اور لاشعور دوست بن جاتے ہیں اور پھر مل کر اپنے نصب العین یعنی کمال حسن کی طرف بڑھنے لگتے ہیں۔ شعور کا لاشعور سے صلح کی کوشش کرنا انسان کا توبہ کرنا ہے۔ اور لاشعور کا شعور سے صلح کرلینا خدا کی رحمت کا لوٹ آنا اور خدا کا توبہ قبول

کرلیتا ہے۔ ایسی صورت میں جب انسان خدا کا ذکر کرتا ہے تو اس کے لاشعور کا جذبہ حسن زیادہ سے زیادہ اظہار پانے لگتا ہے۔ حتیٰ کہ لاشعور، شعور میں پوری طرح جلوہ گر ہوجاتا ہے اور شعور کا اطمینان اور قوت دونوں ترقی کی انتہا پر پہنچ جاتے ہیں۔ یہی خودشعوری کی ترقی کی وہ منزل ہے جہاں ایک حدیث قدسی کے مطابق "خدا انسان کا ہاتھ، پاؤں، جان، آنکھ، دل میں جلوہ گر ہوتا ہے۔" خودشعوری کی یہ معراج ہوتی ہے۔ یہ کمال مرتے دم تک اگر باقی رہ جائے تو موت کے بعد بھی خودشعوری کی راحت اور آسودگی اور ترقی ہی کرتی چلی جاتی ہے۔ یہ ترقی بغیر کوشش کے ہوتی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ یہ ایک ایسی انتہا پر پہنچ جاتی ہے کہ ہم اس کا اندازہ بھی نہیں کرسکتے۔ خدا فرماتا ہے "کوئی شخص نہیں جانتا کہ (اگر وہ خدا کو راضی کرلے تو) اگلی دنیا میں کس قسم کی آنکھوں کی ٹھنڈک اس کے لئے تیار رکھی گئی ہے۔"

قرآن کے مطابق ایسے انسان کو مرتے وقت خدا کی طرف سے یہ بشارت سنائی جاتی ہے۔

"اے مطمئن جان! اپنے رب کی طرف لوٹ جا۔ تو اس سے راضی ہے اور وہ تجھ سے راضی ہے۔ میرے (خاص) بندوں میں مل جا۔ اور میری جنت میں داخل ہوجا۔" (سورۂ فجر)

قرآن یہاں جس چیز کو "جان" کہہ رہا ہے وہ ہمارا لاشعور ہی ہے۔

ذیل کی آیات میں بھی نفس سے مراد لاشعور ہے۔

فی انفسکم افلا تبصرون

یعنی "اور (خدا کی محبت) تمہارے لاشعور میں رکھ دی گئی ہے۔ کیا تم اپنے نفس کے اندر نہیں جھانکتے؟"

غرض خدا کا ذکر اور عبادت جذبہ لاشعور کے اظہار کا صحیح اور کامیاب ترین طریقہ کار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خدا کا ذکر اور عبادت سے انسان کو کامل اطمینان قلب حاصل ہوتا ہے۔ اسی لئے خدا نے فرمایا۔

الا بذکر اللہ تطمئن القلوب

"خبردار! خدا کے ذکر سے دلوں کو اطمینان حاصل ہوتا ہے۔"

فرائیڈ جیسا دہریہ یہ لکھتا ہے۔

"بالکل ممکن ہے کہ صوفیوں کے (ذکر و فکر کے) بعض طریقے نفس انسانی کے مختلف طبقات کے تعلقات کو بدل ڈالیں۔ اس طرح ہماری قوت ادراک لاشعور کی ایسی گہرائیوں پر حاوی ہو جائے جو بصورت دیگر اس کی دسترس سے باہر ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ طریقے ہمیں ایسے ابدی حقائق کی طرف رہنمائی کرتے ہیں جن سے ساری برکتوں کا ظہور ہوگا؟ یہ بات مشکوک ہے۔ تاہم ہمیں تسلیم کرلینا چاہئے کہ ہم نے بھی تحلیل نفس کے علاج کے سلسلے میں یہی طریقہ کار اختیار کر رکھا ہے۔" (قرآن اور علم جدید)

عبادات، ذکرالٰہی اور لاشعور کے باہمی تعلق کو دیکھ کر فرائیڈ کو حیرت ہوئی ہے اور یہ شبہ بھی ہوا ہے کہ "شاید یہاں ابدی حقائق پوشیدہ ہیں جن سے ساری برکتوں کا ظہور ہوگا۔" لیکن بعد میں فرائیڈ اس خیال کو صرف اس لئے رد کردیتا ہے کہ یہ خیال اس کی لادینی ذہنیت سے مطابقت نہیں رکھتا۔ بہرحال فرائیڈ کا یہ شبہ ہمارے اس تصور کو تقویت ضرور پہنچاتا ہے کہ جذبہ لاشعور کی حقیقت خدا کی محبت ہے کیونکہ خدا کی محبت میں حسن وکمال کی محبت ہے یہی نتیجہ انسان کی تمام غلطیوں اور مشکلات کا حل اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے۔

خدا کی محبت کا عمل خدا کے خاص بندوں سے محبت کے ذریعہ پوری طرح انجام پاتا ہے۔ اسی لئے قرآن مجید میں جناب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اور ان کے اہل بیت پاکؑ سے محبت کا حکم دیا گیا ہے۔ اہل بیت رسولؐ کی محبت کو تو اجر رسالت قرار دیا گیا ہے۔ خدا نے ارشاد فرمایا ہے۔

"(اے رسول) فرمادیجئے کہ میں تم سے کسی اجر کا سوال نہیں کرتا سوا اس کے کہ تم میرے قرابتداروں سے محبت کرو۔ اور جو شخص یہ نیکی کماکر لائے گا ہم خود اس کی نیکیوں میں اضافہ کریں گے۔ (اس لئے کہ) خدا بہت معاف کرنے والا اور قدر کرنے والا ہے۔" (سورۂ شوریٰ)

گویا خدا والوں کی محبت ہماری کوتاہیوں کی معافی کا سبب بھی ہے اور

درجات کے بلند ہونے کا سبب بھی ہے اور سب سے بڑی چیز یہ ہے کہ اس محبت کا خدا قدردان ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ انسان کی تکمیل کا اصل راز خدا اور خدا والوں سے محبت ہے، خدا والوں سے محبت اس لئے کی جاتی ہے کہ یہ خدا کا حکم ہے بقول مرزا غالب۔

غالب ندیم دوست سے آتی ہے بوئے دوست

مشغول حق ہوں بندگی بوتراب میں

امام شافعیؒ نے فرمایا کہ آل رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! تمہارے مرتبہ کے لئے بس یہی بہت کافی ہے کہ **من لم یصل علیکم لا صلواۃ لہ**

یعنی جو تم پر درود نہ پڑھے اس کی نماز ہی نہیں ہوتی۔ درود محمدؐ و آل محمدؐ سے محبت کا اظہار ہے اور ساتھ ساتھ ابراہیمؑ اور آل ابراہیمؑ کے حوالے سے تمام انبیاءؑ ماسبق سے تعلق کا اظہار ہے۔

آیات قرآن

سورہ انعام (آیات ۹۸ تا ۱۰۴)

"اور خدا وہی تو ہے جس نے ایک شخص سے تم کو پیدا کیا۔ پھر ہر ایک کے لئے ایک ٹھہرنے کی جگہ (باپ کی پشت) اور سونپے جانے کی جگہ (ماں کا پیٹ اور قبر) کو مقرر کیا۔ لو ہم نے تفصیل کے ساتھ حقیقت کی دلیلوں کو بیان کردیا ہے۔ ان لوگوں کے لئے جو سمجھنا چاہتے ہیں۔(۹۸) وہی خدا تو ہے جس نے آسمان سے پانی برسایا۔ پھر اس کے ذریعہ ہر قسم کی نباتات اگائی۔ پھر اس سے ہرے بھرے کھیت اور درخت پیدا کئے۔ پھر ان سے تہہ در تہہ ایک دوسرے سے گھتے ہوئے دانے نکالے۔ اور کھجور کے شگوفوں میں سے پھلوں کے گچھے پیدا کردیئے۔ جو زمین کی طرف جھکے پڑتے ہیں اور انگور' زیتون اور انار کے باغ اگادیئے جو ایک دوسرے سے بظاہر ملتے جلتے ہیں۔ پھر (ان میں سے) ہر ایک کی خصوصیات اور مزے الگ الگ ہیں۔ پھر جب یہ درخت پھل دیتے ہیں تو ان میں پھل آنے اور ان کے پکنے کی حالت کو ذرا غور و فکر کی نظر سے تو دیکھو ان چیزوں میں خدا کی (قدرت' حکمت' عظمت' نعمت) کی

نشانیاں اور دلیلیں ہیں۔ ان لوگوں کے لئے جو (خدا کو) دل سے ماننا چاہیں۔ اس کے باوجود بھی لوگوں نے جنوں کو خدا کا شریک ٹھہرادیا حالانکہ خدا ہی نے ان کو پیدا کیا ہے۔ پھر انہوں نے بے جانے بوجھے جہالت سے خدا کے لڑکے لڑکیاں تصنیف کر ڈالیں۔ حالانکہ وہ خدا پاک ہے اور بلند وبرتر ہے' ان باتوں سے جو یہ لوگ کہتے ہیں۔(۱۰۰) (خدا تو) وہ ہے جو زمین اور آسمانوں کو عدم سے پہلی پہل وجود میں لانے والا ہے۔ بھلا اس کا کوئی بیٹا کیسے ہو سکتا ہے جبکہ اس کی کوئی بیوی ہی نہیں ہے اسی نے تو ہر چیز کو پیدا کیا ہے اور ہر چیز کا پوری پوری طرح جاننے والا ہے۔(۱۰۱) یہ ہے تمہارا پالنے والا مالک۔ اس کے سوا کوئی خدا نہیں۔ وہ ہر چیز کا پہلے پہل شے سے پیدا کرنے والا ہے تو اس کی بندگی (عاجزانہ اطاعت) اختیار کرو۔ وہی ہر چیز کا کفیل' سرپرست' کام بنانے والا اور نگہبان ہے۔(۱۰۲) اسے نگاہیں پا ہی نہیں سکتیں۔ مگر وہ سب نگاہوں کو پالیتا ہے۔ وہ جسم وجسمانیات اور مادیات سے مبرا ہے اور ہر چیز کی خبر رکھنے والا ہے۔(۱۰۳) تمہارے پاس تمہارے پالنے والے مالک کی طرف سے بصیرت کی روشنیاں آگئی ہیں۔ اب جو ان پر نظر

کرتے ہوئے بینائی یا عقل وبصیرت سے کام لے گا' وہ خود اپنے ہی کو فائدہ پہنچائے گا اور جو اندھا بنا رہے گا وہ خود اپنا نقصان کرے گا اور میں کوئی تمہارا پہریدار (ٹھیکیدار) یا نگہبان نہیں ہوں"۔(۱۰۴)

تشریح :

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا کہ "اگر خدا نہ ہوتا تو دنیا اس نظم وضبط کے ساتھ موجود نہ ہوتی اور چونکہ خدا کی نفی نہیں کی جاسکتی۔ اس لئے اس کے اثبات کے سوا کوئی چارہ نہیں کیونکہ نفی اور اثبات کے درمیان کوئی تیسری صورت ممکن نہیں' (توحید صدوق)

محققین نے اس آیت سے نتیجہ نکالا کہ اس آیت نے قطعی فیصلہ کردیا کہ خدا کو نہ تو دنیا ہی میں دیکھا جاسکتا ہے اور نہ آخرت میں۔ صرف خدا کی نشانیوں اور دلیلوں کے ذریعہ خدا کی صفات کو دیکھا اور سمجھا جاسکتا ہے یہ وہ عقل کا امتحان ہے جس میں کامیابی حاصل کرنے میں انسان کی تکمیل اور حقیقی کامیابی کا دارومدار ہے۔کیونکہ خدا کی ذات اس قدر لطیف ہے کہ نگاہیں اس کو کبھی نہیں پاسکتیں۔ اب یہ کہنا کہ قیامت میں خدا کو نگاہیں پالیں گی۔ اس آیت کے صریح خلاف ہوگا۔ کیونکہ قیامت میں خدا کی ذات اور صفات میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہوگی۔

اسی لئے حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا۔ "خدا کو دل اور ایمان کی بصیرت کی آنکھوں سے دیکھا جا سکتا ہے۔"

حضرت امام رضا علیہ السلام سے ایسے لوگوں کے بارے میں پوچھا گیا جو قیامت میں خدا کو دیکھنے کے قائل ہیں؟ حضرت امامؑ نے فرمایا۔ "جس شخص نے خدا کی صفتیں اس طرح بیان کیں جس طرح خدا نے اپنی ذات کے لئے بیان نہیں فرمائی ہیں' تو اس نے خدا پر سب سے بڑا بہتان باندھا۔ خدا نے اپنے لئے فرمایا۔ "اسے نگاہیں پا ہی نہیں سکتیں۔" اس سے ظاہری آنکھیں ہی مراد نہیں بلکہ وہم وخیال کی آنکھیں بھی مراد ہیں۔(از تفسیر مجمع البیان و تفسیر عیاشی)

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے کہ جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا کہ "اس آیت میں ابصار یعنی نگاہوں سے مراد احاطہ وہم وخیال بھی ہے۔ غرض اس سے مراد آنکھوں کی بینائی ہی نہیں اور نہ اس سے آنکھوں کا اندھا ہونا مراد ہے۔ اس سے مراد احاطہ وہم وخیال ہے۔(تفسیر صافی ص ۱۶۱)

آیت میں بتایا گیا ہے کہ خدا "بدیع" یعنی لاشے سے شے کا پہلی مرتبہ پیدا کرنے والا ہے۔ ہمارے سائنس داں یا ایجاد کرنے والے خدا کی پیدا کی ہوئی چیزوں کو جوڑ جاڑ کر نئی چیزیں بناتے ہیں مگر خدا عدم محض سے چیزوں کو وجود میں لاتا ہے۔

مثلاً اسی آیت میں پھلوں کے پیدا ہونے کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ پھلوں کی تخلیق پر غور فرمائیں تو ان میں کیسی کیسی باریکیاں ہیں۔ کس قدر باریک کیمیاوی اور طبعی تغیرات ہیں۔ پھر ان میں خوشبو' مزہ' جسامت' رنگ' حیاتین کی مقدار پر نظر ڈالیے تو یہ کس قدر پیچیدہ اور مفید تخلیق ہے جو کس قدر خدا کی عظمت' قدرت اور لطافت کی طرف ذہن کو متوجہ کرنے والی ہے۔

پودوں کی غذا نائٹروجن' چونا' پوٹاشیم اور ہائیڈروجن ہوتے ہیں' پودوں کو یہ غذا ٹوٹے ہوئے پتوں' گوبر' ہڈیوں' بالوں اور جانوروں کے خون سے ازخود حاصل ہوجاتی ہے۔ خزاں میں پتوں کا جھڑنا' زمین کو غذا فراہم کرنا ہے۔ ۲۴ ہزار میل لمبی زمین کو غذا اور پانی فراہم کرنا انسان کے بس کی بات نہیں تھی۔ خدا نے پتوں کو کھاد بنایا اور پودوں کی جڑوں تک پہنچادیا۔

پانی پہنچانے کے لئے ڈول سمندروں میں ڈالے۔ ہوا کے رسے ان ڈولوں کو اٹھاکر لے چلے اگر صرف ایک ایکڑ زمین کو سیکڑوں سقے سیراب کرنے لگیں تو سال بھر میں بھی یہ کام انجام نہ دے سکیں گے۔ مگر خدا کی شان دیکھیے ارب دو ارب ٹن پانی سمندروں سے آتا ہے اور پیاسی زمین کو سیراب کردیتا ہے۔ فرمایا "اللہ وہی ہے جو ہواؤں کو سمندروں کی طرف بھیجتا ہے۔ جہاں سے یہ آبی بخارات کو ہانک ہانک کرلاتی ہے۔ اس طرح

ہم مردہ بستیوں کو سیراب کرتے ہیں۔" (فاطر ۱۹)

پھر قدرت کا نظام دیکھئے کہ پودوں کی جڑوں میں بہت چھوٹے چھوٹے کیڑے ہوتے ہیں جن کو بیکٹریا کہتے ہیں۔ ان کی ایک پوری دنیا پودوں کی جڑ میں آباد ہوتی ہے۔ یہ کیڑے زمین کی نائٹروجن کھا کر ایک رس خارج کرتے ہیں جس میں نائٹروجن کی مقدار بہت زیادہ ہوتی ہے۔ نائٹروجن حیات نباتات کا جزو اعظم ہے۔ اگر یہ بیکٹریا نہ ہوں تو پودا اگ ہی نہ سکے۔ اگر یہ بیکٹریا نظر آتا تو دوسرے کیڑے اس کو کھا جاتے۔ اس لئے قدرت نے یہ انتظام کیا کہ وہ دکھائی نہیں دیتے۔ بلند اور پست زمینوں میں ان کی مقدار ضرورت کے لحاظ سے مختلف ہوتی ہے۔ حساب کے مطابق اگر ایک سوا ایکڑ کھیت میں دس کسان ہل چلا رہے ہوں تو بارہ سو مزدوروں کا ایک مخفی لشکر بھی وہاں کام کر رہا ہوتا ہے اب آپ خود فیصلہ فرمائیں کہ کھیتی باڑی میں کتنا حصہ انسان کا ہے اور کتنا حصہ خدا کا ہے۔ خدا فرماتا ہے۔

"اے کھیتی باڑی کرنے والو تم نے کبھی غور بھی کیا کہ اصلی کسان کون ہے؟ تم یا ہم؟ اگر ہم چاہیں تو (بیکٹریا کو کام) سے روک کر تمہارے لہلہاتے کھیتوں کو برباد کر کے تمہارے حواس اڑا دیں"۔ (واقعہ ۶۵ تا ۶۷)

نائٹروجن دنیائے نباتات کی غذا ہے اور نباتات ہماری غذا ہیں۔

جب بادلوں میں بجلی چمکتی ہے تو اردگرد کی آکسیجن نائٹروجن میں تبدیل ہوجاتی ہے اور بارش کے قطرے نائٹروجن کے ذخیرے کو لے کر زمین پر اترتے ہیں اس کا مطلب یہ ہوا کہ بجلی کا ہر تبسم انسان کے لئے ایک پیام حیات ہے۔

خدا فرماتا ہے "بجلی کی چمک (جس سے) تم میں خوف اور امید کی کشمکش پیدا ہوجاتی ہے، اللہ کے معجزات تخلیق ہی سے ہیں۔ کائنات کا مالک آسمانوں سے بارش برسا کر (نائٹروجن کو زمین پر ڈالتا ہے اور) مردہ زمین کو زندہ کردیتا ہے۔ اس کام میں عقل سے کام لینے والوں کے لئے خدا کی دلیل اور سبق موجود ہے"۔ (روم۔ ۲۴)

پھر قدرت کے باریک اور پیچیدہ انتظامات ملاحظہ فرمائیں کہ زمین کو چونے کے علاوہ سلفورک ایسڈ، فاسفورس ایسڈ، نائٹرک ایسڈ اور پوٹاش کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ چیزیں پہاڑوں پر ملتی ہیں۔ اگر یہ کام ہم خود انجام دیں تو ہمیں کدال لے کر ہر ہر پہاڑ پر جانا پڑتا۔ اور کھود کھود کر ان اجزاء کو زمین پر بچھانا پڑتا۔ جس میں صدیاں صرف ہوتیں۔ خدا نے اس کا بندوبست اس طرح کیا کہ بارش کا پانی پہاڑوں پر پہنچایا وہاں کی سردی سے پانی کو برف بنا کر جمادیا پھر گرمی میں اس برف کو پگھلا کر پہاڑی شگافوں پر بہایا اس طرح وہ پانی پہاڑوں کی زمین سے پوٹاش اور سلفر کی ایک دنیا اپنے ساتھ بہا کر لایا۔ پھر یہی پانی نہروں کے ذریعہ ہمارے کھیتوں

پر پہنچا تو زمین کو اس کے تمام ضروری اجزاء فراہم ہو گئے۔ خدا فرماتا ہے۔

"کیا تم دیکھتے نہیں کہ اللہ نے فضا کی بلندیوں سے پانی اتارا جو زمین کی درازوں میں داخل ہو کر پھر چشموں کو صورت میں باہر نکالا اور پھر ان چشموں سے رنگ برنگ کی کھیتیاں نکل آئیں۔" (زمر۔۲۲)

نباتات میں نر مادہ کا ہونا بالکل جدید تحقیق ہے اور نباتات میں خوشی اور غم کے احساسات کا راز بالکل جدید تحقیق سے معلوم ہوا ہے لیکن قرآن نے چودہ سو سال پہلے بتا دیا تھا۔

ومن کل شی خلقنا زوجین (ذاریات)

"ہم نے ہر چیز سے نر و مادہ کے جوڑے پیدا کئے۔"

پھر فرمایا۔ "تم دیکھتے ہو کہ پہلے زمین پیاسی ہوتی ہے۔ پھر جب ہم بارش برساتے ہیں تو وہ خوش ہو جاتی ہے۔ اس کی قوتیں پیدا ہو جاتی ہیں اور وہ خوبصورت درختوں کے جوڑے اگاتے ہیں۔" (حجر۵)

تمام نباتات، حیوانات اور انسانوں کی تخلیق اور ترتیب، آکسیجن، ہائیڈروجن کاربن، نائٹروجن اور چند نمکیات سے ملی ہوئی ہے مگر ان چیزوں کی ملاوٹ سے اس قدر مرکبات تیار ہوئے کہ آج صرف نباتات کی تقریباً ۱۴ لاکھ قسمیں اور حیوانات کی ۱۳ لاکھ انواع واقسام دریافت ہو چکے ہیں۔ ان چند عناصر سے اس قدر رنگ برنگ کی چیزوں کی تخلیق، صناعی کا

حیرت انگیز معجزہ ہے اور خدا کی قدرت و حکمت، عظمت اور رحمت کا بین ثبوت ہے۔

خدا فرماتا ہے "کائنات پر خدا کی مشیت قاہرہ کی حکومت ہے اور اس نے تم پر محافظ مقرر کر رکھے ہیں اور تم میں سے جب کسی کی موت آتی ہے تو اس کو ہمارے پیغام پہنچانے والے (ملائکہ) پورا پورا اٹھا لیتے ہیں۔ پھر اسے اللہ کی طرف لوٹا دیتے ہیں جو ان کا حقیقی آقا و مالک ہے۔ اس کے سوا کوئی خدا نہیں اسی کے لئے حکمرانی ہے اور وہ بہت جلد حساب لینے والا ہے۔" (انعام ۶۱۔۶۲)

بارش خدا کی کتنی بڑی نعمت ہے اور رحمت ہے؟ اس کا اندازہ آپ ۱۹۳۸ء کے اس تخمینے سے کر سکتے ہیں کہ صرف ۱۰۰ میل کے رقبے کو سیراب کرنے کے لئے جس قدر بخارات کی ضرورت ہوتی ہے وہ پانچ لاکھ ٹن کوئلے کو جلانے سے پیدا ہو سکتے ہیں۔ اس حساب سے تمام ہندوستان پر صرف دس منٹ بارش برسانے پر نوے کھرب ٹن کوئلہ جلانا پڑے گا۔ جس کی قیمت چار سو پچاس کھرب روپے بنتی ہے اور یہ رقم حکومت ہند کی سالانہ آمدنی سے تیس ہزار گناہ زیادہ ہے۔

دنیا کا عظیم ماہر عضویات مالن بکس کریدر نے لکھا۔

"خدا کے وجود قدرت و حکمت کا سب سے بڑا ثبوت نظام کائنات کے نظم و ضبط اور اس کی ہم آہنگی میں ملتا ہے۔ ایک ایسی کائنات جس میں

مختلف فطری قوتیں پوری باضابطگی سے مصروف عمل ہیں کہ یہ تصور بھی نہیں کیا جاسکتا ہے کہ یہ نظم' بلا کا نظم وضبط کسی ناظم کے بغیر ممکن ہوسکتا ہے؟ ساری کائنات کے نظم وضبط کا یہ حال ہے کہ سیاروں کی نقل وحرکت کے بارے میں یہ تک بتایا جاسکتا ہے کہ فلاں وقت فلاں سیارہ کہاں ہوگا؟ پھر یہی باضابطگی تمام کیمیائی ردعمل میں پائی جاتی ہے۔ اور یہی نظم وضبط جوہری اور برقی اثرات کے عمل اور ردعمل میں پایا جاتا ہے۔ اس کا یہ نتیجہ ہے کہ طبعی تغیرات کے باقاعدہ فارمولے اور ضابطے دریافت کرلئے گئے ہیں۔ انسان فہم ومشاہدے کی رو سے اس قسم کا نظم وضبط ایک ناظم اعلیٰ اور زبردست کارفرما ذہن کے بغیر ممکن ہی نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ جہاں کہیں بھی کسی قسم کا کوئی منصوبہ ہوا اور اس منصوبے کو ٹھیک ٹھاک عملی جامہ پہنانے والی کوئی طاقت نہ ہو' تو ہمارے مشاہدے کے مطابق وہاں نظم وضبط کے بجائے انتشار اور افراتفری پائی جائے گی"۔(مالن بکس کریدر دنیا کا عظیم ماہر عضویات)

یہی دنیا کا عظیم ماہر عضویات مالن بکس کریدر نے اپنے میدان میں آکر لکھا ہے۔

"ماہر طبعیات کی حیثیت سے مجھے سب سے زیادہ جس چیز نے متاثر کیا وہ انسانی اور حیوانی جسم کے کسی بھی عضو کی تخلیق یا ساخت ہے جو دنیا کے تمام ذہین ترین انسان مل کر بھی انجام نہیں دے سکتے۔ انسان

ذہن سے زیادہ سے زیادہ یہ کرسکتا ہے کہ ان میں سے بعض اعضاء کی حرکات اور ان کے افعال کی محدود پیمانے پر مصنوعی طریقوں سے نقالی کرکے مصنوعی دل، گردے، پھیپھڑے اور مشینی دماغ بنالینا ہی ہماری معراج ہے۔

مثلاً دماغ ہی کو لے لیجیے۔ یہ ناقابل یقین صلاحیتوں کا مالک ہے لیکن اس کی طبعی حقیقتوں کے بارے میں اس سے زیادہ کچھ نہیں پتہ چل سکا کہ اس میں کچھ برق صفت اثرات پیدا کرنے کی صلاحیت ہے اور انہیں کی وجہ سے کچھ کیمیائی تغیرات ظہور پذیر ہوتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ دماغ کی مشینری کے ان گنت کام ہیں جن کا احاطہ کرنا بھی ممکن نہیں۔ یہ دماغ ہی ہے جو تمام اعضاء کو حرکت میں لاتا ہے اور ان پر پورا پورا ضبط اور کنٹرول بھی رکھتا ہے۔ حتیٰ کہ دل کی حرکت اور سانس کی آمدورفت بھی دماغ کے تابع فرمان ہے۔ قوت حافظہ اسی کا ایک کرشمہ ہے۔ دماغ کے نہاں خانے میں ہزاروں شکلیں، صورتیں، خاکے، تصورات، احساسات، جذبات، نظریات محفوظ رہتے ہیں اور ذرا سے اشارہ پر وہ ہماری آنکھوں کے سامنے پھر جاتے ہیں۔ کسی کے لئے ممکن نہیں کہ دماغ کی ان عظیم صلاحیتوں کی کوئی طبعی توجیہہ پیش کرسکے کہ آخر یہ گوشت اور پٹھوں کا لوتھڑا مشکل سے مشکل مسائل کو کس طرح حل کرلیتا ہے؟ اس میں استدلال، استدراک، خواہشات، تحریکات، سکون واطمینان، اضطراب

اور بے چینی کی گوناگوں خصوصیات کس طرح پیدا ہو گئیں۔ اتنے سے دماغ میں جمالیاتی ذوق، حسن کا ادراک اور طلب، سینکڑوں جذبات اور احساسات غیر مرئی حقائق، محبت، نفرت، خودداری اور شخصیت کا ارتقاء جیسی عظیم خصوصیات کہاں سے پیدا ہو گئیں۔

پھر جسم کی پیچیدہ مشینری کو لیجئے اور اس کی مختلف قسم کے کیمیائی عمل میں ضبط و نظم کو دیکھئے۔ جس عمل کو جسم کے باہر اگر کہیں کسی طرح دوہرانے کی کوشش کی جائے تو کبھی ہرگز کامیابی حاصل نہ ہوگی۔ کتنی عجیب بات ہے کہ ہر جسم کے اندر جو نظام نمکیات کے ہاضمہ کے مضر اثرات اور تکان کو زائل کرتا ہے، وہی نشوونما کے لئے سازگار حالات بھی پیدا کرتا ہے، جسم پر بیماریوں کے جراثیم کے حملہ آور ہونے کی صورت میں خون کے اندر دفاعی ذرات وجود میں آتے ہیں۔ پھر ان دفاعی ذرات کی الگ متعین نوعیت ہوتی ہے۔ پھر یہ کہ ہر شخص کا کیمیائی مزاج جداگانہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ وہ کون سا عظیم ترین دماغ ہے جو اتنے کچھ گوناگوں مختلف النوع کیمیاوی امتزاج پیدا کرنے پر قادر ہے؟

عظیم سائنس داں پاسچر کے دور کے بعد اب یہ بات سائنسی طور پر مان لی گئی ہے کہ زندگی جامد اور بے جان مادے سے وجود میں نہیں آسکتی۔ کیونکہ اب سائنس کے تجربات میں اس حد تک کامیابی ہو چکی ہے کہ انتہائی کوششوں کے بعد بھی جدید ترین سامانوں سے لیس لیبارٹریز مختلف

قسم کا ماحول اور کیفیات تک پیدا کرسکتی ہیں اور انہوں نے دماغ کے کچھ اجزائے ترکیبی بھی پیدا کرلئے ہیں۔ وہ کبھی یہ نہیں مان سکتیں کہ تخلیق کائنات انسان کے تمام لوازمات مقرر تناسب سے محض حسن اتفاق سے پیدا ہوگئے۔ یہ بات حساب اور جدید سائنس کے نقطہ نظر سے قطعا" ناممکن الوقوع ہے۔

اور اگر کچھ مادے حسن اتفاق سے وجود میں آبھی گئے تو بھی یہ سوال بدستور باقی رہتا ہے کہ آخر وہ تمام لوازم بقاء اور برقی رو' وہ وحدت' وہ تمام طبعی عوامل کہاں سے وجود میں آگئے جو ان گیسوں سے پیدا ہونے والے مادے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو خلا میں لاکھوں برس سے معلق رکھے رہے یا انہیں حرکت میں لاتے رہے اور جو عوامل آج بھی پوری کائنات کو قابو میں رکھے ہوئے ہیں۔

اسی بناء پر البرٹ آئن اسٹائن نے خدا کی ذات اور اس کے علم وقدرت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"یہ ایک لامحدود اور اعلیٰ ترین قوت وعلت ہے جس کے مظاہرے ناقابل فہم کائنات میں ہر جگہ بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔(ماخوذ از مقالہ ڈاکٹر مارلن بکن کریدر)

انسان کی ترقی کا راز

خدا کا یہ فرمانا کہ "یہ ہے تمہارا پالنے والا مالک۔ اس کے سوا کوئی

خدا نہیں۔ وہی ہر شے کا پہلے پہل لا شے سے پیدا کرنے والا ہے (اس لئے) اس کی بندگی (یعنی) عاجزانہ اطاعت کرو۔"

اس لئے انسان کی ترقی کا راز صحیح آدرش (مقصد حیات) کے تقاضوں کے مطابق عمل کرنا ہوتا ہے۔ صحیح آدرش کے تقاضوں کے مطابق کام کرنے کا نام "عمل صالح" ہے۔ ذکر اور عمل صالح دونوں خود شعوری کی آدرش سے محبت کو ترقی بھی دیتے ہیں اور انسان کے جذبہ حسن و کمال کو تشفی بھی دیتے ہیں اور انسان کی پوری قوت کو سچے آدرش کے زیر تصرف لانے میں بھی مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ اسی سے خودشعوری کی ترقی یا ارتقاء کا عمل انجام پاتا ہے۔ یہی انسان کا تکامل یا ارتقاء ہے۔

جب انسان سچے آدرش کے حسن و کمال کو یعنی خدا کو پہچان لیتا ہے' یعنی خدا پر ایمان لے آتا ہے تو لوگ انسان کی خودشعوری اپنے ارتقاء کے راستے پر پہلا قدم رکھتی ہے۔ پھر اس کا احساس حسن دو طریقوں سے اظہار پاتا ہے۔

(۱) ذکر یا نماز یا تلاوت۔ اس عمل کے ذریعہ انسان اللہ کے اسمائے حسنہ پر غور کرتا ہے اور (۲) پھر اسمائے حسنہ کے تقاضوں کے مطابق عمل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یعنی خدا کے صفات اور احکام کے تقاضوں کو پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یعنی عالمگیر اخلاقی اصولوں کے مطابق عمل کرتا ہے۔ یہی اصل عبادت ہے۔

شروع شروع میں خدا کی محبت کی ابتدا ہوتی ہے اور وہ محبت کمزور ہوتی ہے تو ان اصولوں پر عمل کرنا اس کو مشکل معلوم ہوتا ہے کیونکہ جذبہ حسن کا انسان پر اتنا تصرف نہیں ہوتا کہ وہ سارے اعمال کا سرچشمہ بن جائے۔ یعنی انسان پوری طرح اپنے آدرش صحیح کے تصرف میں نہیں آتا۔ اس کا کچھ حصہ دوسرے تصورات یا آدرش کے تصرف میں ہوتا ہے۔

اس لئے اس کا عمل سچے اور صحیح آدرش کے تقاضوں کے عین مطابق سرزد نہیں ہوتا۔ ایسے ہی موقعوں پر انسان سے غلطیاں اور گناہ سرزد ہوتے ہیں۔

لیکن جس قدر وہ ذکر اور نماز کے ذریعہ خدا کے اسمائے حسنہ پر غور وفکر کرتا جاتا ہے اسی قدر اس کے احساس حسن اور خدا سے محبت میں ترقی ہوتی جاتی ہے۔ اسی محبت کی وجہ سے وہ زیادہ صحت وصفائی کے ساتھ آدرش کی محبت کے تقاضوں کے عمل کو پورا کرتا ہے۔ اس کے علاوہ اس عمل سے اس کا آدرش یعنی خدا سے محبت اظہار پاکر اور طاقتور ہوتی چلی جاتی ہے۔ اب اس کی توجہ اور شعور ارتقا کی منزلیں طے کرتا چلا جاتا ہے۔ اب اس کی توجہ کا مرکز خدا اور اس کے اسماء حسنہ ہوجاتے ہیں جو اس کے وجود میں سما جاتے ہیں کیونکہ اس کا جذبہ حسن پوری طرح تسکین پاتا ہے۔ اس عمل سے خود شعوری کی خدا (یا آدرش) سے محبت

اور قوی تر ہو جاتی ہے۔ اس ترقی یافتہ محبت کی وجہ سے وہ اس محبت کے تقاضوں کو اور بھی زیادہ اچھی طرح سے سمجھتا اور اخلاص کے ساتھ پورا کرتا ہے۔ یہی بندگی اور عبادت کی معراج ہے۔ یہاں پہنچ کر انسان کی خودشعوری اپنی مراد کو پہنچ جاتی ہے اور اس کا خالق اس سے راضی ہو جاتا ہے اور پھر اس کو خدا کی طرف سے خوشخبری سنائی جاتی ہے کہ رضی اللہ عنہم ورضوانہ۔

یعنی "خدا ان سے راضی ہوا اور وہ خدا سے راضی ہوئے"۔ (قرآن)

اس منزل پر خودشعوری خود آپ کو پالیتی ہے۔ قرآن کی اصطلاح میں یہی انسان کے تزکیہ فلاح اور نفس مطمئن کی منزل ہے۔ گویا انسان اس حالت میں جنت کے اندر ہوتا ہے۔ جیسا کہ خدا نے فرمایا۔

"جس نے اپنی جان کو (غلط آدرش کی محبتوں سے) پاک کرلیا وہ کامیاب ہوگیا"۔ (یعنی) جس نے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت والی زندگی اختیار کرلی اس نے بہت بڑی کامیابی حاصل کرلی۔

ایسے ہی انسان سے موت کے وقت خدا کی طرف سے کہا جاتا ہے۔

"اے مطمئن جاں! اپنے پالنے والے مالک کی طرف لوٹ جا۔ تو اس سے راضی ہے، وہ تجھ سے راضی ہے تو میرے (خاص) بندوں میں شامل

ہو جا اور میری جنت میں داخل ہو جا"۔ (قرآن)

گویا جنت نام ہے خدا کی رضا مندی یا محبت کا۔ جیسا کہ خدا نے فرمایا۔

"جنت میں انہیں خدا کی رضا مندی حاصل ہوگی اور یہ بہت ہی بڑی چیز ہے۔ کاش کہ وہ جانیں"۔ (قرآن)

اس مقام پر پہنچ کر خود شعوری کو بے حد سرور حاصل ہوتا ہے۔ خود شعوری خدا کی محبت کی وجہ سے ترقی کرتی چلی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ جب خدا کی محبت کمال کو پہنچ جاتی ہے تو یہ لطف و سرور بھی اپنے کمال کو پہنچ جاتا ہے۔ اس وقت انسان اپنے مطلوب حقیقی (خدا) کی طرف ایک شدید کشش کا جذبہ محسوس کرتا ہے۔ اسے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے خود کو خدا کی محبت میں کھو دیا ہے۔ پھر وہ اس محبت کے تقاضوں کے پورا کرنے میں زبردست لذت محسوس کرتا ہے۔ اس کو نفس مطمئنہ کہتے ہیں۔ اس حالت میں وہ خود کو اپنے معبود کے مقاصد کو پورا کرنے کے لئے وقف کردیتا ہے۔ اس طرح وہ مجازی طور پر ہی سہی نائب خدا کا مقام حاصل کرلیتا ہے۔

کیونکہ اس منزل پر وہ خدا کی ہر عطا' ہر نعمت کو خدا کی مرضی کے مطابق استعمال کرتا ہے اور صرف خدا کی خوشی کے لئے خدا کی مخلوق کی خدمت کرتا ہے اور ایسا کرنے کے لئے اپنے اندر زبردست خواہش اور

رغبت محسوس کرتا ہے جس سے وہ خود کو روک بھی نہیں سکتا۔

اس حقیقت کو قرآن نے اہل بیتؑ رسولؐ کے حوالے سے یوں فرمایا۔

"وہ لوگ بھوکے ہونے کے باوجود خدا کی محبت میں مسکینوں' یتیموں اور قیدیوں کو کھانا کھلاتے ہیں (اس احساس کے ساتھ کہ) ہم تمہیں صرف اللہ کے لئے کھانا کھلاتے ہیں۔ ہم تم سے کسی قسم کا کوئی بدلہ (بلکہ) شکریہ تک نہیں چاہتے"۔(سورۂ دھر)

اسی منزل کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک حدیث قدسی میں اس طرح فرمایا کہ مومن کی محبت عبادت' اطاعت اور نوافل ادا کرنے سے ترقی کرتی چلی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ میں(خدا) اس کا ہاتھ ہوجاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے۔ (خدا) اس کے کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے۔ (خدا) اس کی آنکھیں بن جاتا ہوں جس سے دیکھتا ہے۔

اس منزل کو عرفاء "وصل" کہتے ہیں۔

گویا یہ وہ منزل ہے کہ مومن کا ہر عمل خدا کی مرضی کے عین مطابق ہو جاتا ہے۔ اب جوں جوں مومن خالق سے عملی تعاون کرتا چلا جاتا ہے۔ اس کی خود شعوری کی مخفی قوتیں اجاگر ہوتی چلی جاتی ہیں اور اس کی

خدا سے محبت بڑھتی چلی جاتی ہے۔ وہ اپنے جذبہ حسن اور آدرش کے صحیح تقاضوں کو اچھی طرح سمجھنے اور پورا کرنے لگتا ہے اب اسے اپنی خواہشات کی مخالفت کی مزاحمت زیادہ پریشان نہیں کرتی۔

اس منزل تک پہنچنے کے لئے ضروری ہے کہ انسان خدا کے دیئے ہوئے اس علم سے جو نبیؐ کے ذریعے ملتا ہے' اپنی محبت کی پرورش کرے' بنی کا دیا ہوا علم حسن حقیقی یعنی خدا کے صفات جمال و کمال کا علم ہوتا ہے۔ نیز نبیؐ کے دیئے ہوئے علم میں انسان کی خود شعوری کی ترقی اور تربیت کے لئے تمام ضروری سامان موجود ہوتا ہے جو خود شعوری کی غذا کا کام انجام دیتا ہے جس میں تمام ضروری حیاتیں موجود ہوتی ہیں۔ نبیؐ کے دیئے ہوئے علم کی وجہ سے انسان غلط اور مخالف تصورات یا آدرش کی محبت کی بیماری سے محفوظ ہوجاتا ہے اور اس کی سچی محبت ترقی کرتی ہے۔ اس طرح انسان جب ارتقاء کرتا ہے تو خدا کی صفات سے زیادہ سے زیادہ حصہ پالیتا ہے۔ اور ان کو اپنی ذات کے اندر زیادہ سے زیادہ منعکس کرتا ہے۔ اس منزل پر وہ خدا کا حقیقی خلیفہ بن جاتا ہے۔ پھر خدا اپنی روح انسان میں پھونکتا ہے۔ جب کہ خدا نے حضرت آدمؑ سے فرمایا۔

"جب میں اس کو مکمل کرلوں اور اپنی روح اس میں پھونک دوں تو تم (سب فرشتو) اس کے سامنے سجدے میں گر جانا"۔

جس طرح مصور کی تصویر مصور کی شخصیت اور اس کی صفات کو زیادہ

سے زیادہ منعکس کرتی ہے۔ اس طرح انسان کامل خدائی صفات کو منعکس کرتا ہے۔ جس طرح خدا رحمت اللعالمین ہے اسی طرح خدا اپنے رسولؐ کو بھی رحمت اللعالمین فرماتا ہے۔ جس طرح خدا ولی ہے اسی طرح وہ اس بندے کو بھی ولی کہتا ہے جو رکوع کی حالت میں بھی خدا کی مخلوق کے حقوق ادا کرتا ہے۔

اس طرح انسان جب خدا کی صفات کو اپنے عمل سے منعکس کرتا ہے تو وہ حقیقت میں خدا کے آدرش کو اپنا آدرش بناتا ہے۔ کیونکہ خدا ہی کے تصور حسن نے کائنات کو پیدا کیا ہے۔ جس طرح مصور کا تصور حسن تصویر کو پیدا کرتا ہے۔ اس لئے ہم جوں جوں اپنے اندر خدا کے صفات حسنہ کا عکس یا جھلک پیدا کرتے جا رہے ہیں گویا خدا سے قریب آ رہے ہیں اور خدا کی اس تصویر کو مکمل کر رہے ہیں جو اس نے بنا رکھی ہے۔ اس طرح کائنات ایک مصور کا ہاتھوں سے ارتقاء کرنے والی تصویر کی طرح بتدریج ارتقاء کر رہی ہے۔ اور ایک دن ارتقاء کے کمال کو پہنچ جائے گی۔(قرآن اور علم جدید)

اسی دن خدا کا یہ ارشاد حقیقت کا روپ دھار لے گا کہ "یہ دین اسلام سارے ادیان پر غالب آنے کے لئے بھیجا گیا ہے"۔ وہی انسان کی تکمیل ہوگی۔ جس دن بقول رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اگر قیامت کے آنے میں ایک دن بھی باقی رہ جائے گا تو بھی خدا اس ایک دن کو اتنا

طویل کردے گا کہ وہ شخص ظاہر ہوگا جس کا نام میرے نام پر ہوگا (جو میری اولاد سے ہوگا) اور وہ زمین کو عدل و انصاف سے اس طرح بھر دے گا جیسے وہ ظلم و جور سے بھری ہوگی۔ (بخاری شریف)

آیات قرآنی

"وہ اللہ ہی تو ہے جس نے گھنے گھنے باغ پیدا کیے جو ایسی بیلوں والے ہیں جو (بانسوں' رسیوں وغیرہ کی مدد سے) اونچی کی جاتی ہیں اور کھجور کے درخت پیدا کیے اور طرح طرح کی کھیتیاں اگائیں۔ جن سے طرح طرح کے کھانے کی چیزیں حاصل ہوتی ہیں۔ نیز یہ کہ زیتون اور انار کے درخت پیدا کیے جن کے پھل صورت شکل میں تو ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہوتے ہیں مگر مزے اور خصوصیات میں ایک دوسرے سے الگ ہوتے ہیں۔ تو جب یہ پھل دینے لگیں تو ان کے پھلوں کو کھاؤ اور جب ان کی فصل کاٹو تو اللہ کا حق ادا کرو۔ (یعنی خدا کا زبانی شکر ادا کرو اور عملی شکر بھی یعنی زکواۃ' خمس' عشر صدقات خیرات وغیرہ) اور حد سے آگے نہ بڑھو۔ (یعنی دوسرے انسانوں کا حق نہ مارو) کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ خدا حد سے زیادہ بڑھنے والوں کو دوست نہیں رکھتا (۱۴۱) وہی تو ہے جس نے مویشیوں میں وہ جانور بھی پیدا کیے ہیں جن سے سواری کرنے اور سامان لادنے کا کام لیا جاتا ہے اور وہ جانور بھی (پیدا کیے) جو کھانے اور بچھانے کے کام آتے ہیں۔ (یعنی ان کی کھالوں سے اور

بالوں سے قالین یا فرش بنائے جاتے ہیں) تو کھاؤ ان چیزوں میں سے جو اللہ نے تمہیں بخشی ہیں اور شیطان کی پیروی مت کرو (یعنی ان چیزوں کو کھا کر بدمعاشیاں نہ کرو) (۱۴۲)(سورہ انعام ۶ آیت ۱۴۱-۱۴۲)

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے کہ جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا "کھیتی میں دو حق ہیں۔ ایک وہ جو تم پر واجب ہے اور دوسرا وہ جو تم خوشی خوشی از خود ادا کرو۔ جو حق واجب ہے۔ وہ دسواں اور بیسواں حصہ ہے اور جو حق تم خوشی سے دیتے ہو' وہ خیرات ہے جو یہاں ارشاد ہے۔ غرض اس جگہ خاص طور پر مراد صدقہ ہے جو تمہیں مسکینوں کو دینا چاہئے۔(تفسیر عیاشی بحوال کافی)

آخر میں خدا کا فرمان ہے کہ "حد سے آگے نہ بڑھو" اس سے مراد (۱)ایسا نہ کرو کہ سب کچھ لٹا دو اور گھر والوں کے لئے کچھ بھی نہ رکھو (۲)اور یہ کہ فضول خرچیوں میں سب نہ اڑا دو کہ مسکینوں اور گھر والوں کو نہ دو (۳)اور اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ زکواۃ و عشر وصول کرنے والے زیادتیاں نہ کریں۔(ملخص از مجمع البیان)

خدا یہاں تین باتیں سمجھانا چاہتا ہے (۱)سب باغ' جانور کھیت تم اپنے بل پر از خود حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ یہ سب اللہ کے بخشے ہوئے

ہیں۔ وہی ایسی ایسی عجیب و غریب چیزیں عدم سے وجود میں لا سکتا ہے کیونکہ کسی دوسرے کا اس بخشش میں کوئی حصہ نہیں۔ (۲) دوسرے یہ کہ جب یہ ساری چیزیں خدا کی بخشش ہیں تو ان کا استعمال بھی خدا کی مرضی اور قانون کے مطابق ہونا چاہئے (۳) تیسرے یہ کہ انسانوں کو کوئی حق نہیں کہ ان چیزوں کے استعمال پر اپنی طرف سے پابندیاں لگائیں۔(تفہیم)

عالم حیوانات

بعض ایسے حیوانات ہیں جو صرف چھو سکتے ہیں جیسے پھلوں اور پھولوں پر پلنے والے چھوٹے کیڑے، کچھ ایسے ہیں جن میں تین حواس ہیں، کچھ ایسے ہیں جو دیکھ نہیں سکتے۔ کچھ ایسے ہیں جن میں چار پانچ حواس ہیں۔ مگر قدرت کا کمال دیکھئے کہ ان میں سے ہر جانور اپنی تخلیق میں مکمل ہے۔

غرض اللہ نے حیوانات کی لاکھوں قسمیں بنائی ہیں۔ جن کے رنگ شکلیں خصوصیات و فوائد الگ الگ ہیں۔ حتیٰ کہ بہت چھوٹی مکھی دیکھئے کہ ان میں گردے، ہڈیاں، پھیپھڑے، معدہ، آنتیں، دل و دماغ، آنکھیں، ہاتھ، پیر سب موجود ہیں۔ وہ اڑ رہے ہیں، نسل پیدا کر رہے ہیں۔ مکمل جسم ہیں، ان میں رگیں ہیں جس میں خون دوڑ رہا ہے۔ خدا فرماتا ہے۔

"اللہ نے ہر جانور کو پانی سے پیدا کیا ہے۔ ان میں سے کچھ پیٹ کے بل اور کچھ دو اور کچھ چار ٹانگوں سے چلتے ہیں۔ غرض اللہ

جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے وہ ہر چیز پر قادر ہے"۔(نور ۴۵)

جنگلی جانور اپنی حفاظت خود کرتے ہیں۔ اس لئے بڑے چست چالاک تیز تندرست مکار و عیار ہوتے ہیں۔ جبکہ کچھ جانور جیسے گائے بھینس گدھے وغیرہ کی حفاظت انسان کرتا ہے۔ ان لئے وہ بڑے ست اور بھدے ہوتے ہیں۔ غرض خدا نے ہر چیز کو وہ خواص عطا کرتے ہیں جس کی ان کو ضرورت ہے۔

بعض جانور مہینوں بلکہ سالوں بغیر غذا کے زندہ رہتے ہیں۔ یہ تخلیق کا کتنا بڑا معجزہ ہے جن جانوروں کے دشمن کم ہوتے ہیں وہ بھدے اور بھاری ہوتے ہیں۔ جن کے دشمن زیادہ ہوتے ہیں ان کو خوب بھاگنا دوڑنا پڑتا ہے وہ اس لئے ہلکے اور چالاک ہوتے ہیں۔

عجائبات تخلیق

کچھ سمندروں میں ایک گدھا پایا جاتا ہے جو ڈوبتے ہوئے انسانوں کو اپنی پیٹھ پر بٹھا کر ساحل پر چھوڑ آتا ہے (۲)موتی ایک ایسا جانور ہے جو صدف کی کشتی پر سوار ہو کر پہلے دریا پر تیرتا ہے پھر دریا کی گہرائیوں میں اتر جاتا ہے۔ اس کے منہ سے آگے ایک جالی ہوتی ہے جس سے صاف ستھری غذا چھن چھن کر اس کے منہ میں آجاتی ہے۔ اس جالی کے پیچھے کئی منہ ہوتے ہیں ہر منہ کے چار چار ہونٹ ہوتے ہیں۔ موتی ریت سے پیدا ہوتا ہے (۳)ایک ڈاکٹر لکھتا ہے کہ میں نے ایک ہتھنی کا علاج کیا تو وہ

اچھی ہو گئی۔ پندرہ سال بعد وہ راستے میں مل گئی تو دوڑ کر میرے پاس آئی اور اپنی سونڈ میرے چاروں طرف گھماتی رہی اور اس طرح محبت سے پیش آئی جیسے دو پرانے دوست ایک مدت کے بعد ملتے ہیں (۴)مادہ مینڈک پانی میں انڈے دیتی ہے مگراس کے انڈے ایک بدمزہ جھلی میں لپٹے ہوتے ہیں۔ اس لئے کوئی جانور ان کو نہیں کھاتا۔ مگر بہت سے چھوٹے جراثیم زائل ہوکر نائیٹروجن خارج کرتے رہتے ہیں تاکہ انڈوں کی نشوونما ہوتی رہے۔ نڈوں کی جھلی آہستہ آہستہ سانس بھی لیتی رہتی ہے۔ اس سانس لینے کی وجہ سے انڈے گہرائی سے ابھر کرپانی کی سطح پر آجاتے ہیں۔ جب مینڈک کے بچے پیدا ہوتے ہیں تو پہلے اپنی لمبی دم سے تیرتے ہیں۔ مگرجب ان کے پنجے (چپو) نکل آتے ہیں تو ان کی دم غائب ہوجاتی ہے۔ مینڈک ناک کے علاوہ جسم کی کھال سے بھی سانس لیتا ہے۔

اونٹ کے عجائبات

(۱) اللہ نے اونٹ کوگول پاؤں دیئے ہیں تاکہ ریگستانوں میں چل سکے۔ (۲) لمبی ٹانگیں دیں تاکہ جلدی سفر کرسکے۔ لمبی گردن دی تاکہ بلند درختوں سے غذا حاصل کرسکے۔ (۳) کوہان میں غذا جمع کردی تاکہ پانی اور چربی کی اتنی مقدار ہوسکے کہ مدتوں تک کام آسکے۔ کیونکہ صحرا میں غذا ہر جگہ نہیں ملتی۔ (۵) اونٹ کا دودھ اونٹ والے کے لئے غذا بنایا۔ (٦) اونٹ کی غذا تمام صحرائی پودوں کو قرار دیا۔ ایسے پودے بھی کہ جن

کو دوسرے جانور نہیں چھوتے۔ (۷) اونٹ کا منہ سخت بنایا تاکہ کیکر اور کانٹے بھی کھا سکے۔ (۸) بہت بھاری بوجھ اٹھانے کی طاقت دی۔ (۹) کوہان کے پاس شتربان کے بیٹھنے کی الگ جگہ بنائی۔ (۱۰) اونٹ کو مطیع و فرمانبردار بنایا تاکہ لوگ اس پر سوار ہوسکیں اور کام لے سکیں۔ (۱۱) اونٹ راستے کے نشانات ایک دفعہ دیکھنے پر یاد کرلیتا ہے۔ (۱۲) اونٹ کو بہت کم بیماری لاحق ہوتی ہے۔ ہمیشہ صحت مند رہتا ہے۔ (۱۳) سخت گرمی اور سردی برداشت کرسکتا ہے۔ (۱۴) مالک کا وفادار ہوتا ہے۔ مالک کو پہچانتا ہے اور خطرات میں اس کو بچاتا ہے۔

شترمرغ

صحرا میں بیس سے تیس انڈے دیتا ہے پھر ان کے تین حصے کردیتا ہے۔ ایک حصہ زمین میں دفن کردیتا ہے اور دوسرا دھوپ میں رکھ دیتا ہے اور تیسرے حصے کو سیتا ہے۔ جب بچے نکل آتے ہیں تو دھوپ والے انڈے توڑ کر بچوں کو پلاتا ہے۔ جب وہ انڈے ختم ہوجاتے ہیں تو دفن کئے ہوئے انڈوں کو نکال کر ان میں سوراخ کردیتا ہے۔ جب کیڑے مکوڑے اس پر جمع ہوجاتے ہیں تو ان کو پکڑ پکڑ کر بچوں کے آگے ڈالتا ہے اس طرح بچوں کے معدے مضبوط ہوجاتے ہیں تو پھر وہ پتھر تک کھا جاتے ہیں۔ (دو قرآن)

مکھی کے پانچ پر بھی ہیں اور کئی کئی ہزار ٹانگیں بھی ہیں لیکن مکڑی

جیسا معمولی جانور اس پر قابو پالیتی ہے دوسرے مکھی کتنی حقیر چیز ہے اگر انسان کی غذا میں سے کچھ لے جائے تو ہم اس سے چھین تک نہیں سکتے جب انسان مکھی کے سامنے اتنا بے بس ہے تو خدا کے قوانین کی مخالفت کرکے خدا کی گرفت سے کیسے بچ سکتا ہے خدا فرماتا ہے۔

"اے لوگوں سنو! ہم تمھیں ایک کام کی مثال سناتے ہیں تم جن لوگوں کو اللہ کو چھوڑ کر پکار رہے ہو وہ سب ملکر ایک مکھی تک نہیں بنا سکتے اور اگر مکھی ان سے کوئی چیز چھین لے تو اس سے واپس بھی نہیں لے سکتے۔ مانگنے والے اور جن سے مانگا جارہا ہے دونوں کے دونوں بے بس ہیں انہوں نے اللہ کی وہ قدر نہ کی جو قدر کرنی چاہئے تھی حقیقتاً" (صرف) اللہ ہی غالب' طاقتور اور عزت والا ہے"۔(حج ۸۴)

ایک ماہر سائنس داں نے لکھا کہ کیڑے مکوڑوں کی دنیا میں اگر ہم صرف شہد کی مکھی کے چھتے پر غور کریں تو ان میں بلا کی یکسانیت اور مکمل نظام نظر آتا ہے دنیا کے لاکھوں اربوں شہد کے چھتوں میں سے ہرایک اصول ہندسہ کے مطابق بنایا جاتا ہے اور انتہائی باقاعدہ ہوتا ہے اس قسم کی تمام چیزیں خالق کائنات کی زبردست ذہانت' تدبر' اور رہنمائی کا محکم ثبوت فراہم کرتی ہیں۔

غرض یہ ہے کہ کائنات میں آپ جس چیز کو بھی دیکھئے گا اس میں ایک خاص قسم کی ترتیب' ہمواری' حسن نظام' توازن اور فطرت کے قوانین کی کارفرمائی دکھائی دے گی۔ فطرت کے قوانین اس قدر موزوں دکھائی دیتے ہیں جیسے ایک موزوں شعر یا نظم' جس کا ایک لفظ بھی اپنی جگہ سے نکال دیا جائے تو ساری نظم لنگڑی ہو جائے یہی حال اس نظم عالم کا ہے اب یہ عقل سلیم کا مذاق اڑانا ہوگا کہ اس حسن نظم' توازن اور تعقل کو ایک ایسے مادہ کی کارفرمائی سمجھا جائے جو اندھا بہرا اور بے عقل ہو۔ عہد جدید کا سب سے بڑا سائنس داں نیوٹن اپنے دریافت کئے ہوئے قانون کی تشریح کے بعد لکھتا ہے۔

"کائنات کے اواخر میں باوجود ہزاروں انقلاب زمان ومکان کے جو ترتیب' تناسب اور حسن نظام پایا جاتا ہے وہ ممکن نہیں کہ بغیر کسی ایسی ذات کے پایا جاسکے جو سب سے اول' صاحب علم وارادہ ہو اور مکمل طور پر با اختیار ہو"۔

پروفیسر میکولر نے دنیا کے قدیم آثار کے مطالعہ کرنے کے بعد لکھا۔

"ہمارے اسلاف اور بزرگوں نے خدا کو اس وقت جانا جب وہ شاید اسکا نام بھی نہیں رکھ سکتے تھے"۔

یہ اس بات کی دلیل ہے کہ خدا کو جاننا اور ماننا انسانی فطرت کا بنیادی تقاضہ ہے اسی لئے انسان ہمیشہ سے خدا کے وجود کو مانتا رہا ہے۔

مسلمانوں نے اپنے عہد میں صرف بغداد میں ۱۷۲ رسد گاہیں تعمیر کی تھیں اور صرف حیوانوں' پرندوں اور نباتات پر چھبیس ہزار کتابیں تصنیف کی تھیں۔ مسلمان گھڑیاں بناتے اور مشین چلاتے' زمین کو ناپتے اور زمین اور سورج کے درمیان کا فاصلہ معلوم کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

لیکن آج کے ہمارے علماء صرف شیعہ سنی بحثوں یا بے معنی مسائل میں الجھے ہوئے ہیں ۔ ہر فرقہ کا ملا اپنے فرقہ کو بلا عمل کے بخشوانے کی فکر میں لگا ہوا ہے بقول اقبال۔

خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا مسلم اگر
پھر سلا دیتی ہے اس کو مولوی کی ساحری

انسانی جسم کی مثال

اللہ کے ٹھیک ٹھیک کام کرنے اور سب کچھ جاننے کا اندازہ اسی ایک چھوٹی سی بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ انسانی جسم کی مشین اتنی پیچیدہ ہے کہ اس کو سمجھنے کے لئے اب تک لاکھوں کتابیں لکھی جاچکی ہیں اور پھر اب تک ہم اسکو پوری طرح سمجھ نہیں سکے ہیں۔ اتنا کچھ علم جب صرف اس جسم کی مشین کو سمجھنے اور اسکی خرابی کو دور کرنے کے لئے درکار ہے تو اس مشین کو بنانے کے لئے کتنا علم درکار ہوگا؟

بقول سر آرتھر کانتھ کے "جب ہم چلتے ہیں تو صرف ایک قدم

اٹھاتے ہیں تو ایک سو پٹھے ایک دوسرے سے مل جل کر کام کرتے ہیں اگر ان میں سے ایک پٹھا بھی کام نہ کرے تو ہم قدم نہ اٹھا سکیں۔ اندازہ لگائیے کہ دوسرے پیچیدہ کاموں کے لئے کتنے عضلات اور اعصاب کس کس طرح سکڑتے، مڑتے، اور لچکتے ہوں گے پھر یہ دیکھئے کہ ہر مشین کے لئے ایک ڈرائیور، کلینر، تیل دینے والا، مرمت کرنے والا، ٹھیک رکھنے والا، انجینئر درکار ہوتا ہے آخر وہ کونسی ہستی ہے کہ انسانوں اور حیوانوں کی اربوں در ارب مشینوں کو چالا رہی ہے، مرمت کررہی ہے، تیل دے رہی ہے اور پھر یہ سب کچھ بغیر ہمارے علم کے ہورہا ہے۔(دو قرآن)

خدا نے فرمایا "کہہ دو کہ یہ تو اللہ ہی ہے جو پہلے پیدا کرتا ہے پھر عمل تخلیق کو دہراتا ہے مگر تم کہاں بھٹکتے پھر رہے ہو"۔(یونس ۳۴)

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان آیتوں میں ہمیں خدا کی تخلیق پر غور وفکر کرنے کی تعلیم دی ہے کیونکہ ہم جس قدر خدا کی تخلیق پر غور کرتے ہیں اسی قدر ہم خدا کی قدرت، عظمت، حکمت، علم، دانائی اور خدا کے کمال تخلیق کی گواہی دے سکتے ہیں۔ بقول شاعر۔

ہر جا تری قدرت کے ہیں لاکھوں جلوے

حیراں ہوں کہ دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں

کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جا است

صائبین نے سورج کے کمال کو دیکھا اور اس کو خدا مان لیا۔ زرتشت

نے آگ کے عجائبات دیکھے اور اس کو خدا مان لیا مگر عرفاء کو ہر پھول میں خدا کا حسن دکھائی دیا۔

جس پھول کو سونگھتا ہوں بو تیری ہے

انسان کی عظمت کا اصل راز یہی ہے کہ وہ خدا کی تخلیق کا مطالعہ کر کے خدا کو پہچانے۔ ان مظاہر قدرت و حکمت کو خدا نہ سمجھ بیٹھے۔ بقول ڈاکٹر اقبال۔

کھویا نہ جا صنم کدہ کائنات میں
محفل گداز گرمی محفل نہ کر قبول
نہ تو زمیں کے لئے ہے نہ آسماں کے لئے
جہاں ہے تیرے لئے، تو نہیں جہاں کے لئے

جدید علمائے فلک کا خیال ہے کہ کائنات میں کم سے کم تیس کروڑ زمینیں چکر کاٹ رہی ہیں اور فضا میں اب تک دس کروڑ سورج دریافت ہو چکے ہیں۔ خدا نے فرمایا "اللہ کے لشکروں کا علم صرف اللہ ہی کو ہو سکتا ہے"۔(مدثر)

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ ہمارا سورج ہی ہمارا جہنم ہے اور بعض کا خیال ہے کہ جہنم زمین کے نیچے ہے۔ علمائے جدید نے لکھا ہے کہ زمین کے اندر ۱۳۰۰ درجہ حرارت ہے۔ اسی لئے زمین کے اندر کے معدنیات پگھل کر آتش فشاں پہاڑوں سے نکلتے ہیں۔ اس لئے یہ تصور کیا جا سکتا

ہے کہ ایک شدید زلزلے سے زمین کے اندر کے پگھلے ہوئے معدنیات زمین کے اوپر آجائیں گے تو ہر طرف آگ کے سمندر موجیں مارتے دکھائی دیں گے۔ خدا فرماتا ہے۔

"اے انسانو! اللہ (کی ناراضگی) سے ڈرو کہ قیامت کا زلزلہ ایک بہت ہی خطرناک چیز ہے"۔ اگر زمین کے یہ کھولتے ہوئے مادے اوپر آجائیں تو سمندر کھولنے لگے۔ ہر چیز سے آگ نکلنے لگے' اور تمام فضا سرخ چنگاری کی طرح ہو جائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ خدا قیامت کے دن ایک اور زمین سورج سے نکال لائے جو بے انتہا گرم ہو۔

خدا نے کائنات کو کس طرح پیدا کیا؟

انسان جب کسی چیز کو بناتا ہے تو ظاہری عمل سے پہلے عالم خیال میں عمل کرتا ہے۔ مثلاً جب وہ کسی عمارت کو بنانا چاہتا ہے تو پہلے اس کا نقشہ ذہن میں بناتا ہے۔ اس وقت نہ تو کوئی اینٹ ہوتی ہے نہ چونا اور نہ پتھر۔ صرف ایک نقشہ عمارت کا ذہن میں بنتا ہے۔ اس بات کو فلاسفۂ اسلام نے اس طرح لکھا کہ انسان کو جب کسی چیز کا علم جو اس کے ذریعہ ہوتا ہے تو اس علمی اثر کے بعد انسان میں یہ قدرت پیدا ہو جاتی ہے کہ اپنی معلوم کی ہوئی چیز کو اپنی خیالی قوت سے پیدا کرے۔ یعنی اس کا تصور دماغ میں لائے۔ اب کیونکہ ہماری قوت تخیل کمزور ہے اس لئے وہ چیز خارج

میں وجود میں نہیں آتیں۔ لیکن چونکہ خدا کی قوت تخیل زبردست اور مکمل ہے اس لئے وہ جیسے ہی کسی چیز کا تصور فرماتا ہے فوراً خارج میں وہ چیز وجود میں آجاتی ہے فرمایا۔

"اذا ارادہ شیا" ان یقول لہ کن فیکون "

"وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے وہ چیز فوراً وجود میں آجاتی ہے"۔(سورۂ یٰسین)

اسی طرح جب مرنے کے بعد خدا ہماری قوت تخیل کو کامل کردے گا تو ہم بھی اس قابل ہو جائیں گے کہ جس چیز کا بھی تصور کریں گے وہ چیز فوراً خارج میں موجود ہوجائے گی۔ اسی لئے خدا نے جنتیوں کی صفت ہی یہ بیان کی ہے کہ

لھم فیھا مایشاون

"وہاں ان کے لئے ہر وہ چیز موجود ہوگی جو وہ چاہیں گے" یعنی جس کا وہ تصور کریں گے۔

خدا کی قیومیت و ربوبیت

اور جس طرح ہم اب کسی عمارت کا تصور ذہن میں لاتے ہیں اور پلک جھپکتے ہی جب اس کا تصور ذہن سے ہٹا لیتے ہیں ویسے ہی ہماری وہ خیالی مخلوق معدوم یا فنا ہوجاتی ہے۔ اسی طرح اگر خدا کائنات سے اپنی توجہ ایک آن کے لئے بھی ہٹالے تو پوری کائنات معدوم ہو کر فنا ہوجائے

گی۔ اسی لئے خدا اس کائنات کا "رب" ہے۔ اور "قیوم" یعنی قائم رکھنے والا بھی۔ جس طرح ہماری ذہنی مخلوق جو ہماری کمزوری کی وجہ سے خارج میں وجود میں نہیں آتی مگر پھر بھی ہر لحہ ہماری توجہ کی محتاج ہے۔ اسی طرح ہر لحظہ اور ہر لحہ کائنات کی بقا خدا کی توجہ کی محتاج ہے اسی بات کو آیت الکر ی میں اس طرح فرمایا گیا ہے۔

"اللہ کے سوا کوئی خدا نہیں۔ وہ زندہ ہے اور ساری کائنات کا زندہ رکھنے والا ہے اسے نہ تو نیند آتی ہے اور نہ غنودگی اس کو پکڑ سکتی ہے"۔

کیونکہ اگر خدا کو نیند یا غنودگی آجائے تو سارا عالم فورا درہم اور برہم ہوجائے اس لئے کہ یہ ساری کائنات خدا کے تصور کے سوا کچھ نہیں جو اس کے تصور آنے کی وجہ سے خارج میں موجود ہوگئی ہے اگر ہم کسی چیز کا خیال یا تصور کر کے سو جائیں تو کیا ہماری خیالی مخلوق باقی رہ سکے گی؟ اسی طرح پورا عالم اللہ کے ارادہ یا تصور کے سوا کچھ نہیں۔

خدا کا علم

اور جس طرح ہم اپنی خیالی مخلوق کو جو ہم اپنے ذہن میں پیدا کرتے ہیں اس کے ظاہر و باطن سب سے واقف ہوتے ہیں۔ اسی طرح آپ کو جو نسبت اس اپنی خیالی مخلوق کے ظاہر سے ہوگی وہی نسبت اس کے باطن

سے ہوگی۔ اسی طرح خدا فرماتا ہے۔

"کہ وہی خدا (جو کائنات کا خالق اور قائم رکھنے والا ہے) وہی کائنات کا اول بھی ہے اور آخر بھی۔ وہی اس کا ظاہر بھی ہے باطن بھی۔ اور وہی ہر چیز کا جاننے والا ہے"۔

خدا ہر چیز پر محیط ہے

اور جس طرح ہم اپنی اس مخلوق کو جسے ہم اپنے ذہن میں پیدا کرتے ہیں اس کے ذرہ ذرہ پر خود کو محیط پاتے ہیں۔ اسی طرح خدا فرماتا ہے۔

"اللہ ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے"۔

شرک کی نفی

اور جس طرح آپ اپنے ذہن میں کسی پہاڑ یا عمارت کو پیدا کرتے ہیں تو کیا کسی دوسرے کے ارادے سے اس میں سے کوئی چیز اپنی جگہ سے بن، ہل یا ٹل سکتی ہے؟ نہیں بلکہ اس کا ہر ہر ذرہ صرف اور صرف آپ کے ارادہ کا پابند ہوتا ہے اور دوسرے کا اس میں کوئی عمل دخل نہیں ہوتا۔ بلا شبہ اسی طرح خدا کی تمام مخلوقات صرف خدا کے ارادہ پر بن، ہل یا ٹل سکتی ہیں۔ اسی لئے خدا نے فرمایا۔

"کائنات میں کوئی ایک پتہ بھی خدا کی مرضی کے بغیر حرکت نہیں کرسکتا"۔ نیز فرمایا۔

"اگر اللہ تجھے کوئی نقصان پہنچاتا ہے تو اسے کوئی دور کرنے والا نہیں۔ لیکن اگر وہی خدا تیرے ساتھ بھلائی یا مہربانی کا ارادہ کرلے تو پھر کوئی اس کی مہربانی اور فضل و کرم کو پلٹانے والا بھی نہیں"۔(قرآن)

یعنی اس کائنات کے کسی حصے میں کوئی کام حتیٰ کہ کوئی پتہ بھی اس کے ارادے کے اور مرضی کے بغیر نہیں ہل سکتا جس طرح کسی دوسرے کا تصور یا ارادہ ہماری ذہنی مخلوق پر کسی طرح بھی اثرانداز نہیں ہوسکتا۔

غرض خدا نے عالم کو کس طرح پیدا کیا؟ وہ پورے عالم پر کس طرح محیط ہے۔ عالم کے ہر ذرہ کی حرکت و سکون صرف خدا کے ارادہ سے کس طرح وابستہ ہے؟ خدا اپنی مخلوق کے ظاہر و باطن میں کس طرح پایا جاتا ہے؟ ان سارے سوالات کا حل بجائے باہر' کے انسان خود اپنے اندر پاسکتا ہے۔ اسی لئے حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا۔

من عرفہ نفسہ' فقد عرف ربہ

"جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا۔ اس نے خدا کو پہچان لیا"۔

اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

"ہر چیز اللہ کے سوا ہیچ ہے"۔

خدا کی تخلیقات اسکے تصورات ہیں

اسی طرح خدا عالم کے بعد عالم بناتا چلا جاتا ہے لیکن اس کے باوجود نہ عالم خدا بن سکتا ہے اور نہ خدا کائنات میں حلول ہوتا ہے۔ وہ صرف تصور کرتا ہے۔ گویا ساری کائنات خدا کا خیالی یا تخیلی عمل ہے۔ اب اگر ایسا خدا بتدریج چیزوں کو پیدا کرنے کا تصور کرلے یعنی بیج سے آہستہ آہستہ درخت بنانے کا تصور کرے تو وہ عالم کا رب بھی ہوتا ہے اور قیوم بھی۔ ایسی صورت میں خدا کی مخلوق نہ صرف باقی رہنے میں خدا کی محتاج ہوگی بلکہ اپنے کمال تک پہنچنے میں بھی ہر آن اور ہر لحظہ خدا کے فیض تخلیق و تربیت کی ضرورت مند ہوگی۔

معجزہ کی حقیقت اور آخرت کا ثبوت

معجزہ بھی خدا کے تخیل اور تصور سے پیدا ہوتا ہے۔ خدا کسی چیز کو بتدریج نہیں بلکہ فوراً پیدا کرنے کا تصور فرماتا ہے تو وہ چیز ہمارے لئے معجزہ بن جاتی ہے۔ مثلاً اگر کسی سے کہا جائے کہ لکڑی گل سڑ کر کیمیائی عمل کے بعد مٹی بن گئی۔ مٹی گیہوں اور روٹی بن گئی۔ روٹی مرغی کے بچے نے کھائی۔ مرغی کے بچے کو سانپ نے کھایا۔ گویا وہی لکڑی اب سانپ کی صورت میں لہرانے لگی تو اس بات پر کسی کو تعجب نہ ہوگا لیکن اگر ایسی بات کو سلسلہ ربوبیت کی تدریجی منزلوں سے ہٹا کر یوں کہہ دیا جائے کہ

حضرت موسیؑ کے ہاتھ میں لکڑی سانپ بن کر لہرانے لگی تو بازاریوں میں کھلبلی مچ جائے گی۔ حالانکہ تدریجی اور ربوبی تخلیق کے تصور سے اچانک کسی چیز کے وجود میں آنے کا تصور زیادہ آسان ہے۔ اچانک پیدا ہوجانے کی تخلیق خالق کے صرف ایک معمولی اور وقتی توجہ کی محتاج ہے۔ تعجب ہے کہ تدریجی تخلیق پر تو ہم خدا کو قادر مان لیتے ہیں کیونکہ وہ ہر آن ہمیں دکھائی دیتی ہے لیکن خدا کی اچانک تخلیق کا سمجھنا ہمیں مشکل معلوم ہوتا ہے جو تدریجی تخلیق سے زیادہ آسان ہے کیونکہ اچانک تخلیق میں خدا کو صرف ایک دفعہ اس چیز کا تصور کرنا ہوتا ہے۔ حاصل یہ ہے کہ اگر ہماری خیالی اور تصوری مخلوقات خارج میں وجود نہیں حاصل کرسکتیں تو یہ ہماری تخلیقی قوت کے ضعف کا نتیجہ ہے اور یہ ضعف اس لئے بھی ہے کہ ہم اپنی کسی خیالی مخلوق پر چند سیکنڈ سے زیادہ دیر تک توجہ قائم نہیں رکھ سکتے۔ لیکن جو لوگ دیر تک کسی ایک چیز پر توجہ قائم رکھنے کی مشق کرلیتے ہیں تو ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ ان کے ذہنی تصورات خارج میں وجود کا بھیس اختیار کرنے لگتے ہیں۔ یہاں تک کہ دوسرے لوگ بھی ان کو دیکھ سکتے ہیں۔ مثلاً مسمریزم کی جو لوگ مشق کرتے ہیں، وہ تھوڑی دیر کے لئے اپنے خیالی تصورات کا عکس دوسروں کے حواسوں پر بھی ڈال دیتے ہیں اور جو صوفیا کرام اپنی عبادات میں بڑی دیر تک خدا کا تصور کئے رہتے ہیں، وہ جب کسی پر نظر التفات ڈالتے ہیں یا کسی کے لئے کسی خاص کامیابی

کا تصور کر کے دعا کرتے ہیں تو کہیں زیادہ ٹھوس اور نمایاں قسم کے اثرات چھوڑتے ہیں۔ اس لئے شیخ اکبر محی الدین عربی اپنی کتاب "فصوص الحکم" میں لکھتے ہیں۔

"عارف اپنی محبت اور توجہ سے ایسی چیزیں بنا دیتا ہے جس کا وجود خارج میں ہوتا ہے۔ پھر اسی عارف کی ہمت اور ارادہ اپنی مخلوق کی نگرانی کرتا رہتا ہے۔ وہ اس نگرانی سے تھکتا نہیں۔ اگر عارف اس اپنی مخلوق سے غافل ہوجاتا ہے تو اس کی مخلوق معدوم ہوجاتی ہے"۔(فصوص الحکم)

اسی طرح بڑے لوگ اگر تصور کو ایک جگہ جمانے کی مشق کرتے ہیں تو وہ اپنے تصور سے چڑیلیں اور ہمزاد وغیرہ بنالیتے ہیں اور ان سے کام بھی لے لیا کرتے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ خداوند عالم نے جس ترتیب کے ساتھ تصور کیا تو اسی تصور کو اپنی کن فیکونی قوت سے مخلوق کا رنگ دیدیا۔ اس بات کو خدا نے یوں فرمایا۔

"اللہ زمین و آسمان کا نور ہے"۔

اور حدیث قدسی میں یوں فرمایا۔

"میں ایک چھپا ہوا خزانہ تھا۔ میں نے چاہا کہ میں جانا جاؤں تو میں نے مخلوق کو پیدا کردیا۔"

عمل تخلیق کی تفصیل

پس اسی حی قیوم نے اپنے غیر محدود اسماء اور بے شمار صفات کو جب

اپنا غیر فرض کیا تو اسی کا نام کائنات پڑگیا۔ جس طرح شاعر اپنی بینائی کو نرگس میں، شنوائی کو غنچہ میں، گویائی کو بلبل میں، اپنے حسرت و درد کو لالہ کے پھول میں، اپنے استقلال کو ساحل سمندر میں اور اپنی بے چینی کو دریا کی موجوں میں فرض کرلیا کرتا ہے، بلکہ کبھی کبھی تو شاعر اپنی تنہائیوں میں خود اپنی ذات کو بھی اپنا غیر فرض کرکے اس سے سوال جواب بھی کرلیا کرتا ہے، تو اس طرح کرنے سے شاعر کی ذات، صفات میں کوئی عیب یا کمی نہیں پیدا ہوتی تو اسی طرح اگر وہ ذات جو غیر محدود صفات و کمالات کی مالک ہے، اپنے اسماء وصفات کو مختلف مدارج کے لحاظ سے اپنا غیر فرض کرلیتا ہے، تو اسی نسبت سے مخلوقات خارج میں وجود پاتی جاتی ہیں اور اِس عمل سے خالق میں کسی قسم کا کوئی نقص یا کمی واقع نہیں ہوتی۔ بس فرق صرف اتنا سا رہتا ہے کہ ہمارے مفروضات ہماری قوت ارادی کے کمزور ہوجانے کی وجہ سے مفروضات ہی بن کر رہ جاتے ہیں اور ان سے آثار کا ظہور نہیں ہوتا۔ مثلاً اگر ہم آگ کا تصور کریں تو اس سے حرارت یا سوزش پیدا نہیں ہوتی مگر جب خدا آگ کا تصور کرتا ہے، تو جس قدر وہ تصور کرتا ہے اسی قدر روشنی اور حرارت کے آثار پیدا ہوجاتے ہیں۔ جس چیز میں خدا اپنی صفت حیات کو جس مقدار میں فرض کرلیتا ہے وہ چیز اس حد تک زندہ ہوجاتی ہے اور جس چیز میں جس مقدار میں علم فرض کرلیتا ہے اس میں اتنا ہی علم پیدا ہوجاتا ہے اور کائنات میں کثرت

مخلوق کا سبب خدا کے بے شمار اسماء حسنیٰ اور بے شمار کلمات ہیں جو ہر لحظہ اور ہر آن ظاہر ہو رہے ہیں۔ "کل یوم ھو فی شان" یعنی ہر روز اس کی الگ شان ہے۔ اسی سرچشمہ سے تمام مخلوقات بن رہی ہیں۔ گویا ہر چیز خدا کے کسی اسم یا صفت کی آئینہ دار ہے۔

رد شرک اور عبادت کی حقیقت

سورہ انعام (آیت ۱۶۴ - ۱۶۵)

"کہئے کہ کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور مالک تلاش کروں؟ حالانکہ وہی تو ہر چیز کا مالک' پالنے والا' ترقی دینے والا' نقطہ کمال تک پہنچانے والا ہے۔ کوئی شخص بھی برائی نہیں کرتا مگر یہ کہ وہ خود اپنا ہی نقصان کرتا ہے اور کوئی شخص دوسرے شخص کے گناہ کا ذمہ دار نہیں۔ پھر تم سب کو اپنے پالنے والے مالک کی طرف پلٹنا ہے۔ اس وقت وہ تمہیں وہ سب کچھ بتادے گا جن میں تم آپس میں اختلاف کیا کرتے تھے۔(۱۶۴)وہی (خدا) تو ہے جس نے تمہیں زمین پر گزرے ہوئے لوگوں کی جگہ لینے والا (خلیفہ) بنایا اور تم میں سے کچھ کو دوسروں کے مقابلے پر درجوں میں بلندی عطا کی تاکہ جو کچھ اس نے تمہیں دیا ہے' اس میں تمہارا امتحان لے۔ (یعنی یہ دیکھے کہ تم دولت پاکر خدا کو بھول تو نہیں جاتے اور غریبوں کے حقوق ادا کرتے ہو یا نہیں) بے شک تمہارا پالنے والا مالک (خدا) سزا دینے میں بھی بہت تیز ہے۔ اور حقیقتاً" وہ بڑا معاف کردینے والا بھی ہے اور بے حد مسلسل رحم کرنے والا بھی"۔(۱۶۵)

"خدا کو چھوڑ کر کسی اور کی بندگی اختیار کرنا عقل اور فطرت دونوں کے خلاف ہے۔ اسلئے کہ جانور بھی اس کے سامنے دم ہلاتا ہے جو اس کے کھانے پینے کو دیتا ہے۔ نیز یہ کہ خدا کے سوا کسی اور کی بندگی اختیار کرنا فطرت کائنات کے بھی خلاف ہے کیونکہ ساری کی ساری کائنات صرف ایک خدا کی اطاعت کر رہی ہے۔ اب یہ کہنا کہ ہمارے باپ دادا تو ایسا نہیں کرتے تھے' تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہر شخص اپنے کئے کا خود ذمہ دار ہے۔ غرض کائنات کی ساری چیزوں کا مالک خالق تو اللہ ہے' تو پھر یہ بات کیسے معقول ہوگی کہ ساری کائنات تو اللہ کی اطاعت کے نظام پر چل رہی ہو اور میں کائنات کا ایک چھوٹا سا جزو ہوں' اپنی شعوری اور اختیاری زندگی کے لئے کوئی اور مالک تلاش کروں؟ کیا ہماری کائنات تو ایک سمت میں چل رہی ہو اور میں ایک اکیلا کوئی دوسرا رخ اختیار کروں؟ (تفہیم)

خدا کو دل سے مان لینے سے ہمیں وہ راحت اور آسودگی حاصل ہوتی ہے جو ہمیں اپنی جبلتی خواہشات کی تشفی سے حاصل ہوتی ہے بلکہ بعض اوقات وہ راحت جو خدا کو ماننے اور اس سے محبت کرنے سے حاصل ہوتی ہے' بڑی قوی اور مسرت انگیز ہوتی ہے۔ اس کی وجہ ہماری فطرت کے قوانین کے اندر موجود ہے۔ اس لئے کہ ہمارا کوئی فعل ہمیں اس وقت تک آسودہ نہیں کر سکتا جب تک وہ براہ راست ہماری فطرت کے کسی تقاضے کو پورا نہ کرتا ہو۔ ہمارا ہر فعل ہمیں اتنی ہی آسودگی بخش سکتا

ہے جس حد تک وہ ہمارے کسی فطری تقاضے کو پورا کرتا ہے۔ ہماری ساری اعلیٰ سرگرمیاں ہماری قدرتی اور اصلی خواہشات کو پورا کرتی ہیں۔ یہ خواہش ہمارے جذبہ لاشعور کی خواہش ہے جو طلب حسن وجمالی میں بے تاب رہتی ہے۔ یہی جذبہ حسن وکمال ہمارے لاشعور کے اندر ایک سمندر کی طرح لہریں مار رہا ہے۔ اسی جذبے کو ہمارا شعور غلط فہمی کی بناء پر جنسی خواہشات سے تعبیر کرتا ہے اور لاشعور کی تسکین کی خاطر ان کی تشفی کا درپے ہوتا ہے۔

جب ہم حسن وکمال کو دریافت کر رہے ہوتے ہیں تو کہا جاتا ہے کہ ہم صداقت، علم، حقیقت کی تحقیق میں مصروف ہیں۔ جب ہم حسن کو رنگ سنگ، یا تصویر کے مادی لباس میں ظاہر کر رہے ہوتے ہیں تو کہا جاتا ہے کہ ہم فنکاری میں مصروف ہیں۔ جب ہم اسی جذبہ حسن وکمال کو اپنے اچھے اعمال سے ظاہر کر رہے ہوتے ہیں تو کہا جاتا ہے کہ ہماری فعالیت اخلاقی قسم کی ہے۔ یہ حسن اخلاق ہے۔ جب ہم اپنی ساری قوتوں سے حسن کی خدمت پرستش کرتے ہوئے اس کے قرب کی کوشش کر رہے ہوتے ہیں تو کہا جاتا ہے کہ ہم آدرشوں کی عبادت کر رہے ہیں۔ ہماری یہ مختلف خواہشات جنسی خواہشات کی بدلی ہوئی صورتیں نہیں بلکہ ہماری اصل خواہشات ہیں، جو جنسی خواہشات سے الگ ہیں بلکہ ان پر حکمران ہیں۔ جب ہم لاشعور کی اس اصلی خواہش طلب حسن کو مطمئن کرنے کی کوشش

کرتے ہیں تو ہمیں عظیم لذت اور راحت حاصل ہوتی ہے۔ یہ راحت اور لذت ایسی بڑھیا قسم کی ہوتی ہے کہ ہم اس کی وجہ سے اپنی جبلتی اور جنسی خواہشات کی لذت سے قطع نظر کرنے اور ان کو فراموش کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔

الٹی بات

بدقسمتی سے فرائیڈ نے اصل صورتحال کو الٹا کر کے دکھایا ہے۔ وہ ہماری فطری خواہش طلب حسن وکمال کو جو لاشعور کے تقاضائے حسن سے پیدا ہوتی ہے' ایک غلط اور بگڑی ہوئی خواہش سمجھتا ہے۔ وہ یہ نہیں سمجھتا کہ ہمارا شعور ہمارے جذبہ لاشعور کی غلط ترجمانی کر کے اس خواہش حسن وکمال کو جنسی خواہش کی شکل میں ہمارے سامنے لاتا ہے جبکہ ہمارے طلب حسن کا اصل محرک ہماری جنسی خواہشات نہیں بلکہ لاشعوری جذبہ حسن ہے۔ جب یہ جذبہ طلب حسن خدا کی محبت میں پوری طرح سکون پاتا ہے تو جنسی خواہشات کو روکنے کے باوجود ہم اعصابی امراض اور ذہنی مجادلات کا شکار نہیں ہوتے۔ یہ حقیقت اس بات کا ثبوت ہے کہ ذہنی الجھن کا سبب جذبہ حسن کی رکاوٹ ہے۔ صرف جنسی خواہشات کی رکاوٹ ذہنی الجھن کا سبب نہیں ہوتی کیونکہ جذبہ طلب حسن بھی ہمارے لاشعور کا حصہ ہے۔

ہماری اور کائنات کی حقیقت

ہم کو خدا نے اپنے حسن کی طلب کے لئے پیدا کیا ہے۔ عرفاء کے نزدیک پوری کائنات خدا کے اسماء حسنہ کی جلوہ گاہ ہے۔ ساری کائنات میں خدا کے اسماء وصفات مختلف مدارج کے لحاظ سے جلوہ فرمارہے ہیں۔ اس پوری کائنات کو صوفیاء "شخص کبیر" کہتے ہیں۔ جب اسی شخص کبیر یعنی پوری کائنات کو چھوٹے پیانے پر بطور خلاصہ کائنات خدا نے دوبارہ تصور فرمایا اور اپنے سے الگ فرض کیا تو اسی سے ایک ہستی نکلی جس کا نام انسان ہے۔ اس چھوٹی سی شخصیت میں وہ سب کچھ ہے جو اس سے باہر ایک ایک چیز میں جدا جدا پایا جاتا ہے۔ اس لئے انسان خلاصہ کائنات یا ارتقاء کی آخری منزل ہے۔ انسان ساری کائنات کی کتاب مجمل اور نسخہ جامع ہے۔ اس لئے جن لوگوں نے انسان کی باطنی قوتوں کو کریدا' تو انہیں اس چھوٹے سے قالب میں عالم انوار کے سارے نظام موجود نظر آئے۔ انہوں نے انسان کے قالب میں مختلف نظام موجود پائے۔ انہوں نے انسان کے قالب میں مختلف مقامات میں مختلف انوار کے مرکز مشاہدہ کئے۔ کہیں سرخ کہیں سفید۔ انہیں سبز انوار کے نقطہ نظر آئے۔ ان نقطوں کے کھل جانے کے بعد انسان پر نت نئے حالات اور انکشافات ظاہر ہوتے ہیں جن کا پورا اندازہ صرف عقل وحواس رکھنے والوں کو نہیں ہوسکتا۔ انہیں انوار کے باطنی انشراح کا نام مقام نبوت

ہے۔ اسی انوار کے کھل جانے کو شق صدر یا شرح صدر کہتے ہیں۔ جب ان انوار کے دروازے کھولے جاتے ہیں تو عرفانی اصطلاح میں انہیں لطائف اسرار کہتے ہیں۔ اکابر صوفیاء نے ان لطائف واسرار کی مجموعی تعداد پانچ بتائی ہے۔ انرجی اور نور کے یہی نقطے عالم کبیر میں فرشتوں کی شکل اختیار کرلیتے ہیں۔ اور جب یہ نورانی نقطے بالکل نظرانداز کردیئے جاتے ہیں اور انسان ان کے تقاضوں کے بالکل خلاف عمل کرتا رہتا ہے اور ان نقطوں کی پرورش خدا کے ذکر و فکر اور اطاعت کے ذریعے نہیں کرتا تو وہ نقطے غفلت اور گناہوں سے ڈھک جاتے ہیں۔ پھر اچھا خاصا انسان برائیوں' شرارتوں اور بدمعاشیوں کا ڈھیر بن کر رہ جاتا ہے۔ خارج میں اس عمل کا نمونہ شیطان ہے۔ اور جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "ہر انسان کے ساتھ ایک غیر مرئی ہستی پیدا کی جاتی ہے جو اس کا شیطان ہوتا ہے جو اسے ہر وقت بہکاتا رہتا ہے۔"

اسی شیطان کا نام قدیم عالموں کی زبان میں ہمتا یا ہمزاد تھا اور اس پر جدید عہد کے اسپیریچولزم (Spritualism) کے تجربات کی بنیاد قائم ہے۔ ہمارے اندر ہمارا شیطان ہے اور خارج کی آفاقی کائنات میں بھوت' پریت' چڑیل کے الفاظ سے دنیا کی ہر قوم اس کو جانتی پہچانتی ہے۔

غرض صفاتی لحاظ سے جن جن چیزوں کا مظاہرہ آفاق میں ہوا ہے' انسان میں بھی کسی نہ کسی طرح وہ تمام چیزیں پائی جاتی ہیں۔ بالفاظ دیگر

خدا کے تمام صفات جلال و جمال کا انسان کو مظہر بنایا گیا ہے۔ کائنات میں انہیں صفات کو فرض کر کے کن فیکون کے عمل کے ذریعہ تخلیق کا رنگ بخشا گیا اور پھر ان کا ارتقاء ربوبیت کی شان سمجھانے کے لئے کیا گیا۔ اور چھوٹے پیانے پر یہ سب عمل انسان کے بھیس میں بھی عمل میں لایا گیا۔

خلافت انسانی (انسانی تخلیق کی حقیقت)

اب صرف ایک بات رہ گئی کہ خدا نے اپنے اسماء صفات کو اپنے سے باہر فرض کیا تو ساری کائنات بن گئی۔ لیکن جب خدا نے خود اپنی ذات کو اپنے سے باہر فرض کیا تو انسان خلق ہوا۔ اسی بات کو قرآن میں اس طرح فرمایا "اے شیطان! تو نے آدم کو سجدہ کیوں نہ کیا جب کہ میں نے آدم کو اپنے دونوں ہاتھوں سے پیدا کیا ہے۔" یعنی میں نے آدمؑ کو اپنی ذات اور تمام صفات جلال و کمال کا مظہر بنایا۔ خدا کا یہی ارادہ تھا جس کو خدا نے فرشتوں کے سامنے یوں فرمایا۔

"میں زمین میں اپنا خلیفہ بنانے والا ہوں۔"

اور یہ بھی فرمایا کہ "جب میں اس میں اپنی روح پھونک دوں تو تم (تمام ملائکہ) اس کے سامنے جھک جانا" رسول اکرمؐ کی یہ حدیث کہ۔

"اللہ نے آدم کو اپنی صورت پر بنایا" کا مطلب بھی یہی ہے۔

غرض جس طرح شخص کبیر یعنی کائنات میں ایک روح یا نقطہ مرکزی یا

(کائنات کی انا) خدا ہے' اسی طرح شخص صغیر یعنی انسان میں ایک شعوری نقطہ خدا نے پیدا کیا جس کو ہر شخص "میں" یا "انا" کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے۔

یہی خلافت الہیہ جس کا ہر انسان مجازی اور محدود حد تک مظہر ہے۔ لیکن یاد رہے کہ اللہ کی شان مدارج کے لحاظ سے لا محدود ہے اسی طرح خلافت عامہ یا خلافت مجازی یا خلافت جزئی تو ہر انسان کو حاصل ہے۔ لیکن مدارج کے اختلاف کی وجہ سے خلافت کا درجہ حقیقی اور مکمل معنی میں ایسی ہستیوں پر جاکر ختم ہوتا ہے جو خدا کے تمام اسماء و صفات اور ذات کا کامل طور پر مظہر ہیں۔ وہی لوگ نوع انسانی کے کامل ترین افراد بلکہ تکوین و تخلیق کا آخری نتیجہ قرار پاتے ہیں۔ جرمن کے مشہور فلسفی نٹشے نے تو اپنے سارے فلسفہ کی بنیاد ہی ارتقاء کی اسی آخری تقویم کی تلاش پر رکھی اور مافوق البشر کا نظریہ قائم کیا۔

قرآن نے ایسے ہی فرد کو کبھی "رحمۃ للعالمین" اور کبھی "خلق عظیم" کہا کبھی "امام مبین" کہا اور کبھی ان کی طہارت اور ولایت کی گواہی دی۔ اسی قسم کے افراد کو انبیاءؑ' ائمہؑ اور اولیاء کہا جاتا ہے۔ ان میں سب سے افضل و اعلیٰ تمام کمالات کے خاتم اور سارے اسماء و صفات الٰہی کے اظہار کا انتہائی آخری نقطہ محمد مصطفیٰؐ کی ذات ہے۔ اور محمد مصطفیٰؐ نے بارہ ہستیوں کو اپنا خلیفہ' جانشین' نائب اور امام فرمایا۔ جس کا ذکر

بخاری شریف میں بھی موجود ہے اور حضرت علیؑ کے لئے تو اپنی نیابت کو بالکل واضح الفاظ میں یوں فرمایا۔

"اے علی تمہارا مقام میرے پاس وہی ہے جو ہارونؑ کا مقام موسیٰؑ کے بعد ہے۔" (بخاری شریف)

غرض یوں عالمین کے رب کی ساری حمد اور سارے کمالات مخلوق بن کر محمدؐ اور آل محمدؐ اور انبیاء کرامؑ کی شکل میں مکمل ہوئے۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ محمدؐ صرف نام ہی نہیں بلکہ قدرت کا آخری کام بھی ہے۔

سوال نمبر ۱: جب خدا نے اپنے ہی کمالات، صفات، اسماء و شیون کو اپنے سے باہر فرض کرکے پیدا کیا ہے، تو پھر اس عالم میں ناقص، عیب دار، مضر، تکلیف دہ چیزیں کیوں ہیں؟ جب کہ خدا کے تمام اسماء ہر عیب سے پاک ہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ عالم کی ہر چیز خدا کے تمام صفات اور اسماء حسنیٰ کی مظہر اور آئینہ دار نہیں ہے۔ بلکہ بتدریج مختلف اشیاء میں صفات کے مختلف مدارج کا ظہور ہوا ہے، اور ہو رہا ہے۔ کسی میں ایک صفت کا، کسی میں دو اور کسی میں تین کا۔ غلطی یہ ہوتی ہے کہ ہم مختلف چیزوں کا ایک دوسرے سے مقابلہ کرتے ہیں پھر اس میں عیب یا نقص نکالنے لگتے ہیں۔ حالانکہ ہر چیز اگر کسی ایک کمال سے محروم ہے تو کیا اسی وقت دوسرے کمال یا کمالات کی آئینہ داری نہیں کر رہی ہوتی ہے؟ یقیناً جو چیز

کسی صفت کا مظہر نہیں ہے تو پھر اس صفت کو اس چیز میں تلاش کرنا، اس چیز کا نقص نہیں ہے بلکہ تلاش کرنے والے کا جہل ہے۔ جو صرف نمک میں قورمہ کا مزہ تلاش کررہا ہے تو اس میں نمک کا کیا قصور؟ قصور تو نمک کے اندر قورمہ کا مزہ تلاش کرنے والے کا ہے۔

غرض عالم کا ہر ذرہ صفات الٰہیہ کے مختلف اصناف اور مدارج کا مظہر ہے۔ اس لئے ایک کے آثار و خواص کا دوسرے میں پایا جانا ناممکن ہے۔ جدید تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ عالم میں کوئی چیز کسی دوسری چیز سے مکمل طور پر مشابہ نہیں ہے۔ حتیٰ کہ کہا گیا ہے کہ گلاب کی دو پنکھڑیاں بھی ایک دوسرے کی مکمل طور پر مشابہ نہیں ہیں تو اس تحقیق سے عرفاء کے اس دعوے کی تصدیق ہوگئی کہ خدا کی تجلیات میں تکرار نہیں ورنہ خدا پر عبث کاری کا الزام آتا۔ یعنی ایک ہی صفت کا ایک ہی درجہ میں دو مرتبہ ظاہر کرنا بے فائدہ ہے۔

اصل میں عالم کی جس چیز میں نقص ہے وہ کمالات سے خالی ہونے کا نتیجہ ہے۔ اور خدا کی ذات ہر نقص سے پاک ہے۔ اور ہر چیز میں جو کمال ہے وہ اس چیز کا کامل نہیں بلکہ خدا کا کمال ہے۔ اس لئے صوفیاء وحدۃ الوجود کو بھی مانتے ہیں اور وحدۃ الشہود کو بھی۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ عالم کی اصل حقیقت صرف عدم ہے اور اس کے تمام نقائص کی ذمہ دار اس کی یہی حقیقت ہے۔ اب اس میں جو وجود کے کمالات نظر آتے ہیں

ان کا سرچشمہ خدا کی ذات ہے۔ اس لئے عالم میں نقص خدائی صفات کے ظہور کی وجہ سے نہیں بلکہ ان چیزوں میں خدا کی دوسری صفات کے ظہور سے خالی ہونے کا نتیجہ ہے۔

اصل میں یہ سارے نقائص بھی صرف ان کو دکھائی دیتے ہیں جو آفاق والنفس کے سارے اجتماعی مرقع کو یکجا طور پر نہیں دیکھ سکے۔ یا جو اجتماعی طور پر عالم کے ماضی، حال اور مستقبل، ظاہر اور باطن کو نہیں دیکھ سکتے۔ ورنہ جن کی نگاہیں وسیع ہیں وہ تو یہ کہتے ہیں کہ۔

ہمہ عالم گواہ عصمت او است

یعنی عالم میں جو چیز ناقص نظر آتی ہے، سارے عالم کے لئے وہی کمال ہے۔ مثلاً جو لوگ زلف وگیسو، چشم وابرو کو الگ الگ کر کے دیکھتے ہیں، وہ کبھی ان کے حسن سے وہ سرور حاصل نہیں کر سکتے جو کسی کے عارضی زیبا پر زلف سیاہ کے آراستہ ہونے کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ یعنی دوسرے الفاظ میں کمان کا کمال یہی ہے کہ وہ ٹیڑھی ہے اور تیر کا کمال ہی یہ ہے کہ وہ سیدھا ہے۔ لیکن دونوں کا کمال اس وقت ظاہر ہوتا ہے جب دونوں کو ملا کر دیکھا جائے گا۔

اس لئے یاد رکھئے کہ کائنات کے کمالات دراصل حق تعالیٰ کے غیر محدود اسماء وصفات کے مختلف مدارج، مراتب کے مظاہر اور تجلی گاہیں ہیں۔ اس لئے ایک ہی نوع کے دو فرد بھی ہر لحاظ سے ایک جیسے نہیں۔

خدا نے اپنے تمام اسماء وصفات کے امتزاج کے مختلف نتائج کو خوب ناپ تول کر، جانچ پرکھ کر پیدا کیا ہے۔ کیونکہ خدا اپنے اسماء وصفات کو ترکیبوں کے مختلف نتائج سے خوب واقف ہے۔ خدا کے اسی اندازہ کو مذہب کی زبان میں تقدیر کہتے ہیں۔ یعنی ہر چیز کی ترکیب کے تمام نتائج کا اندازہ خالق نے پہلے ہی کرلیا ہے۔ خدا نے فرمایا۔

قدجعل اللہ بکل شی قدرا

یعنی اللہ نے ہر چیز کا اندازہ کرلیا ہے۔

یا فرمایا۔ "ہم نے ہر چیز کو ایک خاص انداز سے پیدا کیا۔" اگر خدا کی صفات کے تمام مدارج کا ظہور ایک ہی چیز میں ہو جاتا تو یہ ان گنت چیزوں والی دنیا صرف ایک شے والی دنیا بن کر رہ جاتی۔

غرض کائنات عالم میں جو آثار بھی دکھائی دے رہے ہیں یہ سب خدا کے اسماء وصفات کے مظاہر ہیں اور ہر آن، ہر لحہ خدا اپنے ارادہ کن فیکون سے اپنے اپنے وقت پر ہر چیز کو ظاہر بھی کررہا ہے اور پروان بھی چڑھا رہا ہے۔

کائنات میں جو کچھ بھی ہو رہا ہے، وہ صرف اذن حق، فعل حق اور تقدیر حق سے ہو رہا ہے اور ہوگا۔ اسی حقیقت کو عرفاء توحید صفاتی، توحید آثاری، ہمہ اوست (یعنی ہر چیز خدا کا مظہر ہے) ہم باوست (یعنی ہر چیز خدا کی وجہ سے قائم ہے) ہمہ ازاوست (یعنی ہر چیز کا خالق خدا ہے) کے

الفاظ اور اصطلاحوں سے ظاہر کرتے ہیں۔

شر کا وجود کیسے ہوا؟

سوال نمبر۲۔ اب سوال یہ باقی رہا کہ پھر شر کا وجود کیوں ہے؟ خدا نے فرمایا۔ "تم کو جو اچھائی پہنچتی ہے تو وہ اللہ کی طرف سے ہوتی ہے اور تم کو جو برائی پہنچتی ہے وہ خود تمہاری جانب سے ہوتی ہے۔" اس کا حاصل یہ ہے کہ جن چیزوں سے انسان کو راحت وسکون ملتا ہے یا جو چیزیں اچھی معلوم ہوتی ہیں وہ تو خدا کی طرف سے ہیں۔ لیکن جن چیزوں سے اذیت ہوتی ہے یا جو بری معلوم ہوتی ہیں، اگرچہ ان کا اصل خالق تو خدا ہی ہے مگر ان کے پیدا ہونے کی وجہ انسان کا اپنا عمل ہوتا ہے۔ اس لئے خود انسان اس کا ذمہ دار ہے۔ کیونکہ انسان کا مقام خلافت الہیہ ہے۔ یعنی انسان میں خدا کے تمام اسماء وصفات کے مختلف مدارج کا اجمالی طور پر ظہور ہوا ہے۔ اس لئے انسان میں خدا کی قدرت اور اختیار کا بھی ظاہر ہونا ضروری تھا کیونکہ خدا میں جو کچھ بھی ہے سب کا اجمالی طور پر عکس انسان میں ہے۔ یہی خلافت الہیہ کے معنی ہیں۔ ساری کائنات کی تقدیر جبر تھی ان میں کہیں انتخاب یا قوت فیصلہ کی جھلک تک نظر نہیں آتی۔ لیکن انسان کی تقدیر کا اقتضاء اختیار تھا جو انسان کی زندگی کے ہر شعبہ میں نمایاں ہے۔ اس لئے انسان اپنے ان تمام اعمال کا ذمہ دار ہے جن میں اسکی قوت انتخاب اور قوت فیصلہ کو دخل ہے۔ اسی لئے جو لوگ انسان

کے اختیار کے عنصر کا انکار کرتے ہیں، وہ حقیقت میں خدا کی تقدیر اور اپنی فطرت کے اقتضاء کو اور انسان کے خلیفہ الٰہی ہونے کو جھٹلاتے ہیں۔ نیز یہ کہ انسان میں اختیار ہونا عقلاً "، مشاہدتاً " اور شرعاً " بھی ثابت ہے۔ گویا ساری کائنات کی تقدیر جبر ہے اور انسان کی تقدیر اختیار ہے۔ انسان میں اختیار اسلئے ہے کہ وہ خدا کا مجازی خلیفہ ہے۔ انسان کے اس اختیار کی وجہ سے خدا نے اپنی ہدایتیں انبیاءؑ اور کتابوں کی شکل میں بھیجیں اور ساتھ ساتھ انسان میں امانت کا جذبہ بھی رکھا۔ یعنی انسان اپنے اعمال میں اس کی مرضی کا پابند ہے جس کا یہ امین ہے۔ اب انسان کے اس اختیار نے اس کے اعمال کو دو حصوں میں بانٹ دیا۔ ایک وہ اعمال جو خدا کی مرضی کے مطابق ہیں۔ ان کو خیر، بر، نیکی، حسنہ، عمل صالح کہتے ہیں۔ اس پر قائم رہنے کا نام عبدیت ہے۔ دوسرے قسم کے وہ افعال ہیں جو خدا کی تعلیم اور مرضی کے خلاف ہیں جس کو اثم، برائی، پاپ، عصیان، کفر، گناہ کہتے ہیں۔ اب جو آدمی اپنے اختیارات کو خدا کی تعلیم اور مرضی کے مطابق استعمال کرے گا وہ خدا کے سارے قوانین کو اپنی مرضی اور اپنے احساسات کے مطابق پائے گا۔ اس حقیقت کی انتہا کا نام جنت ہے۔ جنت میں انسان کو بھی وہی دکھایا جائے گا جو وہ دیکھنا چاہتا ہے اور وہی سنایا جائے گا جو وہ سننا چاہتا ہے۔ خدا نے فرمایا۔ "جنت میں تمہارے لئے وہی سب کچھ ہوگا جس کے لئے تم خواہش کروگے اور ہر وہ چیز ہوگی جو

تم طلب کروگے"۔ مقصد یہ ہے کہ جنت میں خیر ہی خیر ہوگا۔ کیونکہ جنتی نے دنیا میں خیر کا ذخیرہ اپنے اچھے افکار و اعمال سے جمع کیا تھا۔

خلاصہ یہ ہے کہ شر کا وجود انسان کے اختیار کا نتیجہ ہے جب وہ اپنے اختیار کو خدا کی مرضی کے خلاف استعمال کرتا ہے تو اس کا نتیجہ شر یا جہنم ہوتا ہے۔ جس طرح جنت خدا اور بندے کی کلی موافقت کا نام ہے' اسی طرح جب انسان اپنے اختیارات کو خدا کی مرضی سے ٹکراتا ہے اور امانت میں خیانت کرتے ہوئے ان کو استعمال کرتا ہے تو آخرکار خدا کی مرضی بھی اس سے ٹکرانے لگتی ہے۔ انسان اور خدا کے ارادوں کا یہی تصادم آخرکار بڑھتے بڑھتے اس مقام تک پہنچ جاتا ہے جہاں انسان خدا کو اور اس کی ساری قوتوں کو اور قوانین کو اپنے سارے جذبات اور احساسات کے مخالف پائے گا۔ اس مقام کا نام النار یا جہنم ہے۔ جہاں کا ہر قانون انسان کی ہر خواہش اور ہر احساس کے مخالف ہوگا۔ خدا نے اس بات کو یوں فرمایا ہے۔

"جب بھی جہنمی جہنم سے نکلنا چاہیں گے وہ اسی میں دوبارہ پلٹا دیئے جائیں گے۔"

غرض خلافت انسانی کا اقتضاء اختیار تھا۔ اختیار کا اقتضاء خدا کی طرف سے تعلیم اور شریعت کا آنا تھا اور امانت کا حق ادا کرنا تھا۔ ان سب کا اقتضاء جزاء وسزا تھا۔ یہی انسان کی تقدیر ہے۔ اس لئے ثابت

ہوا کہ شر کا وجود باہر نہیں بلکہ ہمارے اندر ہے۔

لیکن یہ بات بھی یاد رکھنی ضروری ہے کہ انسان میں اختیار تو ہے لیکن اس اختیار پر اسے اختیار نہیں۔ انسان کا اختیار تاثیر اور نتیجہ میں خدا کے اختیار سے وابستہ ہے۔ جس وقت اور جس حد تک خدا چاہے انسان کو اس کے اختیار سے محروم کرسکتا ہے اور کرتا رہتا ہے۔ اس لئے انسان نہ تو پوری کائنات کی طرح مجبور مطلق ہے اور نہ خدا کی طرح مختار کل ہے۔ اس لئے حضرت امام جعفرصادق علیہ السلام نے فرمایا۔

"انسان کا مقام جبرواختیار کے درمیان ہے"۔

اگر خدا انسان کو اپنی اطاعت پر مجبور کرتا تو پھر انسان خلیفہ الٰہی کے منصب پر نہ رہتا بلکہ عالم کی دوسری چیزوں کی طرح ہوجاتا۔ خلافت الٰہی کا تقاضا ہی یہ ہے کہ اس کو عمل اور انتخاب میں اختیار دیا جائے۔ انسان کے اسی اختیار کے غلط استعمال نے شر کی آگ بھڑکائی۔ اگر انسان اپنے اختیارات کو اپنے ناقص علم اور تجربوں کے بجائے خدا کی خواہش کے مطابق استعمال کرے تو وہ خدا کا مجازی خلیفہ ہوگا' اور جو انسان کامل طور پر اپنے اختیارات کوخدا کی مرضی کے عین مطابق استعمال کرے گا' وہ خدا کا حقیقی معنی میں خلیفہ ہوگا۔

غرض انسان کی غرض تخلیق یہی ہے کہ وہ حق امانت ادا کرے۔ یعنی خدا کے دیئے ہوئے اختیارات کو جو امانت ہیں' خدا کی مرضی کے مطابق

استعمال کرے یہی عبدیت ہے۔ یعنی انسان کی معراج ہے اور غرض تخلیق ہے۔

قدرت کے باریک انتظامات

سورہ اعراف (آیت ۵۷۔۵۸)

"اور وہی اللہ ہے جو ہواؤں کو اپنی رحمت کی بارش کے آگے آگے (بارش برسنے کی) خوشخبری لئے ہوئے بھیجتا ہے۔ پھر جب وہ ہوائیں پانی سے لائے ہوئے بادل اٹھالیتی ہیں، تو انہیں کس مردہ زمین کی طرف بھیج دیتا ہے۔ پھر وہاں بارش برسا کر اس (مردہ زمین) سے طرح طرح کے پھل (پھول) نکالتا ہے۔ بس اس طرح ہم مردوں کو (زندہ کر کے قبروں سے) نکال لیں گے۔ شاید اب تم (اس مشاہدہ سے) سبق لے کر اس کا اثر قبول کرو گے۔(۵۷) (غرض) جو اچھی اور پاکیزہ زمین ہوتی ہے وہ اپنے پالنے والے مالک کے حکم سے خوب پھل پھول لاتی ہے۔ لیکن جو زمین ہی خراب ہو، اس میں صرف بری گھاس اور ناقص پیداوار کے سوا کچھ نہیں نکلتا۔ یوں ہم اپنی باتوں میں طرح طرح کی حقیقتیں، دلیلیں اور نشانیاں بار بار پیش کرتے ہیں، ان لوگوں کے لئے جو شکر ادا کرنے والے ہیں۔(۵۸) (سورۂ اعراف آیت ۵۷، ۵۸)

تشریح :

حضرت امام باقر علیہ السلام سے روایت ہے کہ جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ "زمین حالت فساد میں تھی۔ خدا نے محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ (خدا کی معرفت کرا کے) اس کی اصلاح کی۔ پھر حکم دیا کہ اب اصلاح ہوجانے کے بعد زمین میں خرابیاں پیدا نہ کرو۔ (تفسیر صافی ص ۱۷۴ بحوالہ کافی۔ و تفسیر عیاشی)

آیت سے معلوم ہوا کہ خدا کی رحمت اور ہدایات کی بارش تو سب پر یکساں ہوتی ہے۔ اب جو لوگ نیک طبیعت اور حق کے متلاشی ہوتے ہیں، وہ تو اس سے خوب خوب فائدے اٹھاتے ہیں، مگر بدنیت بدکردار، جاہل، عیش پرست، وقتی فائدوں کے پیچھے بھاگنے والے لوگ ان عظیم حقیقتوں پر غور ہی نہیں کرتے۔ اس لئے ایسے لوگوں کو آیت میں خراب یا بنجر زمین سے تشبیہ دی گئی ہے۔ انُ پر خدا کی آیتوں اور دلیلوں کا کچھ اثر نہیں ہوتا۔ محققین نے نتیجہ نکالا کہ خدا کی دلیلوں کا اثر مشینی طور پر ازخود نہیں ہوا کرتا۔ بلکہ خدا کی دلیلوں کا اثر صرف اور صرف اسی وقت ہوتا ہے اگر جب انسان حق کا طلبگار ہوکر ان پر غور و فکر کرتا ہے۔ جن لوگوں پر عقلی دلیلوں کا اثر ہوتا ہے ان کو خدا نے پاک وصاف زرخیز زمین سے تشبیہ دی ہے کیونکہ وہ خدا کی آیتوں پر غور کرکے خدا کی معرفت جیسی عظیم نعمت کا پھل، حاصل کرلیتے ہیں۔ جس کا منطقی نتیجہ خدا کی

اطاعت ہے اور خدا کی اطاعت ہی جنت کی کنجی ہے اور انسان کی تکمیل ہے۔

مینی توریا یونیورسٹی کینیڈا کے سائنسدان پروفیسر فرینک ایلسن لکھتے ہیں کہ زندگی کو قائم رکھنے کے لئے اس کرۂ ارض پر اتنے بے شمار انتظامات نظر آتے ہیں کہ اس بات کو کسی طرح قبول نہیں کیا جاسکتا ہے کہ یہ سب کچھ صرف ایک اتفاق ہے۔ (۱) اولاً" تو یہ کرۂ ارض ایک گولے کی شکل میں خلا میں معلق اپنے قطبی محور پر اس طرح گھوم رہا ہے کہ اس میں ایک مرتب ترتیب کے ساتھ نہایت ہی باقاعدگی کے ساتھ دن کے بعد رات اور رات کے بعد دن آتے جارہے ہیں۔ پھر یہ تمام حرکات جلد ہی کرۂ ارض کو اس کی صحیح سمت پر قائم رکھتی ہیں۔ جس کی مدار کی جانب زمین کا ۲۳ درجہ جھکاؤ موسموں میں باقاعدگی پیدا کرتا ہے۔ جس کے نتیجے میں زمین کا زیادہ سے زیادہ حصہ آبادکاری کے قابل ہوجاتا ہے اور ساتھ ساتھ زمین پر قسم قسم کے پھل پھول اور نباتات پیدا ہوتے ہیں۔ اگر یہ کرۂ ارض زمینی گردش کرنے کے بجائے ساکن وجامد ہوتا تو نہ رات دن ہوتے اور نہ موسموں کا یہ تغیر ہوتا اور نہ پیداوار میں اس قدر تنوع (Variety) ہوتا۔ تو آخر وہ کون ہے جس نے زمین کو ایک خاص زاویے پر جھکایا اور اس کو مسلسل گھما رہا ہے؟

(۲) ایسی گیسیں جو زندگی کو باقی رکھنے کے لئے بے حد ضروری ہوتی ہیں

فضا میں تقریباً پانچ سو میل کی بلندی تک زمین کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں اور اس طرح ان کا ایک بہت موٹا پردہ زمین کو ان شہابوں کی تباہ کن بارش سے محفوظ رکھتا ہے جو روزانہ تقریباً دو کروڑ کی تعداد میں تیس میل فی سیکنڈ کی رفتار سے کرۂ ارض کی فضا میں داخل ہوتے ہیں۔ نیز یہ کہ گیسز کا یہ دبیز پردہ زمین کے درجہ حرارت کو حداعتدال کے اندر رکھتا ہے جو زندگی کی بقا کے لئے نہایت ضروری ہے۔

پھر پانی کو ملاحظہ فرمایئے کہ اس میں قدرت نے چار خصوصیات رکھ دی ہیں۔ (الف)پانی کم سے کم درجہ حرارت میں آکسیجن کی زیادہ سے زیادہ مقدار کو جذب کرلیتا ہے۔ (ب)جب پانی جمتا ہے تو نقطہ انجماد سے چار درجے سینٹی گریڈ کے اوپر اس کی کثافت (Dencity) انتہائی حد کو پہنچ جاتی ہے۔ اسی وجہ سے دریا اور جھیلیں عموماً منجمد نہیں ہوتیں۔ (ج)برف کی کثافت پانی سے کم ہوتی ہے جس کی وجہ سے برف پانی کے اوپر تیرتی رہتی ہے۔ (د)جب پانی جمنے لگتا ہے تو کثیر مقدار میں حرات خارج کردیتا ہے اسی وجہ سے سردیوں کے طویل موسم میں دریاؤں' جھیلوں اور سمندروں کے اندر بے شمار حیوانات زندہ رہ جاتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو سارا پانی جم جاتا تو پھر اس میں کوئی زندگی باقی نہ رہتی۔

زمین کو دیکھئے کہ مٹی پودوں کو ایسے نمکیات اپنے پاس سے ہر وقت مہیا کرتی ہے جنہیں جذب کرکے مختلف قسم کے نباتات اور پودے زمین کا

سینہ چیر کر باہر نکل آتے ہیں اور جاندار مخلوق کا رزق بنتے ہیں۔

زمین کے بالکل قریب مختلف قسم کی دھاتیں پائی جاتی ہیں جن کی وجہ سے تہذیب اور ترقی کے امکانات پیدا ہوتے ہیں مثلاً لوہے کی وجہ سے مشین، موٹریں، ہوائی جہاز اور مختلف اوزار بن سکے۔

اب اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ اس عالم وجود کے پیچھے کوئی اسکیم اور کوئی کام کرنے والی قوت موجود نہیں تو لامحالہ یہ اقرار کرنا پڑے گا کہ یہ ساری کائنات محض ایک اتفاق (Accident) کے نتیجہ میں ظاہر ہوگئی ہے جبکہ اتفاق سے کوئی نہایت پیچیدہ انتہائی ترقی یافتہ منظر، حسابی تحقیق ممکن ہی نہیں۔ مثلاً پروٹین جو تمام ذی حیات خلیوں کے اجزائے لازم کی حیثیت رکھتے ہیں، پانچ عناصر پر مشتمل ہیں۔ کاربن، ہائیڈروجن، نائٹروجن، آکسیجن اور گندھک۔ پھر یہ پروٹینی سالمہ عناصر کے چالیس ہزار دقیق ذرات پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ پوری کائنات میں ۹۲ کیمیائی عناصر ہیں یہ بالکل منتشر اور غیر مرتب حالت میں بکھرے ہوتے ہیں۔ اب ان ۹۲ عناصر کے بے تربیت ڈھیر میں سے نکل کر یہ پانچوں عناصر ایک خاص تربیت کے ساتھ اس طرح باہم ملتے ہیں کہ ایک پروٹینی سالمہ وجود میں آجاتا ہے۔ اب یہ کیسے ممکن ہے کہ بغیر کسی مرتب کرنے والے کے ان ۹۲ عناصر کے بے ترتیب ڈھیر سے نکل کر پانچ عناصر اس خاص ترتیب کے ساتھ ازخود اس طرح ملے کہ پروٹینی سالمہ ازخود وجود میں آگیا؟

ایک سوئٹزرلینڈ کے حساب داں چارلس ایوجین گائی نے اس کا حساب لگایا ہے تو معلوم ہوا کہ ایسے کسی اتفاقی واقعہ کا امکان صرف ۱۶۰-۱۰ کے مقابلے میں صرف ایک درجہ ہو سکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دس کو ۱۶۰ مرتبہ پے در پے ضرب دیا جائے۔ یہ اتنا بڑا عدد ہوگا کہ اعداد کی زبان میں اس کا اظہار بھی مشکل ہے۔ غرض اب حادثہ یا اتفاق بعید از امکان ہے۔ کیونکہ پروٹین امینوایسڈ کے لمبے لمبے سلسلوں سے وجود میں آتے ہیں اور اس میں سب سے زیادہ اہمیت اس طریقے کی ہے جس سے یہ سلسلے باہم ملتے ہیں۔ اگر یہ ذرا بھی غلط تناسب سے جمع ہو جائیں، تو زندگی کی بقا کا ذریعہ بننے کے بجائے مہلک زہر بن جاتے ہیں۔ گویا زندگی کو چاروں طرف سے موت گھیرے ہوئے ہے۔

انگلستان کے پروفیسر بے جی لینڈ نے حساب لگایا ہے کہ ایک سادے سے پروٹین کے سلسلوں کو لاکھوں طریقوں سے یکجا کیا گیا تو زندگی وجود میں نہ آسکی۔ تو یہ بات عقل میں نہیں آسکتی کہ ایک پروٹین سالمہ کو وجود میں لانے کے لئے اتنے ارب بعید از امکان اتفاقات بیک وقت وجود میں آئے ہوں۔

پھر یہ کہ پروٹین تو خود صرف ایک کیمیائی چیز ہے جس میں زندگی تو موجود ہی نہیں ہوتی۔ اس میں زندگی کی حرارت اور رمق صرف اس وقت پیدا ہوگی جب ان میں روح پھونکی جائے گی۔ صرف ایک کامل ترین

صاحب عقل ذات زندگی کی آماجگاہ بنانے کے لئے اس طرح کے ایک سالے کو وجود میں لاکر زندگی بخش سکتا ہے۔ یہی واحد وہ تصور ہے جو منطقی (Scientific) ہے (ملخص از نگارشات رنگارنگ' مجموعہ مقالات مولانا باقر شمس)

ہندوستان کے مشہور عالم ابوالکلام آزاد نے اس حقیقت کو بڑے خوبصورت الفاظ میں لکھا ہے۔

"نظام ربوبیت کا یہ پورا کارخانہ خودبخود وجود میں آجائے اور کوئی زندگی' کوئی ارادہ' کوئی حکمت اس کے پیچھے کارفرمانہ ہو؟ کیا یہ ممکن ہے کہ اس کارخانہ ہستی کی ہر چیز میں ایک بولتی ہوئی پروردگاری' ایک ابھرتی ہوئی کارسازی تو موجود ہو' مگر کوئی کارساز موجود نہ ہو؟"

کیا یہ محض ایک اندھی بہری فطرت اور بے جان مادہ اور بے حس الیکٹرون کے خواص ہیں جن سے پروردگاری اور کارسازی کا یہ عظیم اور نہایت پیچیدہ کارخانہ ظہور میں آگیا جبکہ اس کے پیچھے کوئی عقل وارادہ رکھنے والی ہستی موجود نہیں۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ گویا پروردگاری تو موجود ہے' مگر کوئی پروردگار موجود نہیں۔ کارسازی تو موجود ہے مگر کوئی کارساز موجود نہیں۔ گویا سب کچھ تو موجود ہے مگر کوئی موجد موجود نہیں۔

عمل بغیر کسی عامل کے' نظم بغیر کسی ناظم کے' قیام بغیر کسی قیوم کے' عمارت بغیر کسی معمار کے' نقش بغیر کسی نقاش کے' تصویر بغیر کسی مصور

کے، سب کچھ بغیر کسی موجد کے کیسے ممکن ہے؟ یہ بات کوئی انسانی فطرت کبھی باور نہیں کر سکتی۔ انسان کا وجود پکارتا ہے کہ ایسا ہونا ممکن نہیں۔

(ترجمان القرآن)

مثلاً درخت ہی کو لیجئے جس کی مثال آیت میں دی گئی ہے۔ درخت ہماری طرح کھاتے پیتے، سانس لیتے، بڑھتے، بچے پیدا کرتے ہیں۔ ان کی مشینری انسانی جسم کی مشینری سے کم حیرت انگیز نہیں۔ وہ ہماری طرح زندگی کی کشمکش میں ہر وقت مشغول ہیں۔ وہ آپس میں لڑتے جھگڑتے ہیں مگر ان کی اہمیت یہ ہے کہ وہ ہمارے لئے سلک کی قمیص، ململ کے کپڑے، لٹھے کا پاجامہ، الماری میں سجی کتابیں، اخبارات، رسالے، لفافے ٹکٹ وغیرہ فراہم کرتے ہیں۔ وہ کیونکہ درخت ہی تو ہیں جنہیں مزدور کاٹ کاٹ کر کارخانوں میں لاتے ہیں۔ ایک چھوٹے سے بیج پر غور کیجئے کہ وہ کس قدر پیچیدہ مشین ہے جو پورا ایک درخت اپنے دامن میں لئے بیٹھا ہے۔ جب اتنا سا بیج ایک پورا درخت بن سکتا ہے تو اگر انسان کچھ بننے پر تل جائے تو کیا کچھ نہیں بن سکتا؟ بقول اقبال۔

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا\
ورنہ گلشن میں علاج تنگی داماں بھی تھا

نباتات خلیوں (Cells) سے بنتے ہیں۔ ہر خلیہ کی بیرونی دیوار آکسیجن، ہائیڈروجن اور کاربن سے مرکب ہوتی ہے۔ جڑ کے آخری

کنارے پر سخت خلئے کی ایک ٹوپی چڑھی ہوتی ہے۔ جو سخت سے سخت چٹانوں کے سینے کو چیر کر رکھ دیتی ہے۔ جب یہ ٹوپی گھس جاتی ہے تو نئی بدل دی جاتی ہے۔ ہر پودے میں ایک مادہ ہوتا ہے جو اسے رنگین بناتا ہے جسے کروفل (Chlorophyll) کہتے ہیں۔ یہ سورج کی روشنی سے تیار ہوتا ہے اور اس کی وجہ سے پودوں کو سبز رنگ ملتا ہے اور یہی مادہ فضا سے کاربن لے کر اسکو شکر اور نشاستہ میں تبدیل کر دیتا ہے کیونکہ پودے کو اپنی نشوونما کے لئے فاسفورس' پوٹاش اور نائٹروجن درکار ہوتے ہیں اور کمال یہ ہے کہ یہی عناصر پانی میں حل شدہ پائے جاتے ہیں۔ پودے پانی میں سے ان عناصر کو چوس لیتے ہیں اور فالتو پانی کو عمل تبخیر کے ذریعہ جسم سے باہر نکال دیتے ہیں۔ ایک ایکڑ زمین میں صرف پھولوں کے پودے ایک سال میں دو ہزار ٹن پانی خارج کرتے ہیں۔

اب ذرا درخت کی جڑ کو دیکھئے کہ وہ زمین کی گہرائی سے پانی نکال کر درخت کی چوٹی تک پہنچا رہی ہے۔ یہ عمل کشش ارضی کے خلاف ہو رہا ہے۔ اصل میں درخت کی جڑیں کھوکھلی نالیاں ہیں جو پانی کو اوپر کی طرف کھینچ رہی ہیں۔ نہ وہاں انجن ہے نہ بجلی' مگر پانی اوپر کھینچ رہا۔ کیا اتنے پیچیدہ عجیب وغریب پر حکمت باریک انتظامات ازخود اتفاقی طور پر ہر ہر درخت میں قائم ہوسکتے ہیں؟

اب ذرا درختوں کے پتوں کو دیکھئے۔ (۱) یہ فقط خوبصورتی کے لئے

نہیں ہوتے بلکہ ہر پتے میں چھوٹے چھوٹے سے ہزاروں سوراخ ہوتے ہیں جن کے ذریعہ پودا (۲) سانس لیتا ہے۔ (۳) حیوانات کی پیدا کی ہوئی زہر یعنی آکسیجن کو اندر لے جاکر اس میں ایسی تبدیلیاں کرتا ہے کہ وہ زندگی بخش بن جاتی ہے۔ (۴) پھر یہ سوراخ رات کو ازخود بند ہوتے ہیں۔ گویا رات کو پودے سوجاتے ہیں۔ اسی لئے اگر سورج کی روشنی نہ ملے تو اکثر مرجاتے ہیں۔ (۵) پتے کاربن کو شکر اور نشاستہ میں تبدیل کرکے سردیوں کے لئے رکھ چھوڑتے ہیں اور کچھ بیج بنانے کے لئے بچاکر رکھتے ہیں۔ (۶) کیونکہ نشاستہ پانی میں پوری طرح حل ہوکر درخت کے مختلف حصوں میں پہنچ نہیں سکتا اس لئے پودے اس نشاستے کو پہلے شکر میں تبدیل کرتے ہیں اور پھر اس شکر کو پانی میں ملاکر ادھر ادھر بھیجتے ہیں اور منزل مقصود پر پہنچاکر پھر شکر کو نشاستے میں تبدیل کردیتے ہیں۔ (۷) بعض پتے رات کو سمٹ کر بند ہوجاتے ہیں تاکہ سورج سے حاصل کی ہوئی حرارت کو ٹھنڈی ہوا سے بچائے رکھیں جس طرح ایک ننگا فقیر سردی کی حالت میں سکڑ کر لیتا ہے تاکہ جسمانی حرارت کو بچاسکے۔ (۸) پتوں کی مختلف شکلیں ان کی ضرورت کے لحاظ سے ہوتی ہیں۔ کسی پودے کو حرارت آفتاب کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے، تو اس کے پتے لمبے اور پتلے ہوتے ہیں تاکہ وہ زیادہ حرارت جذب کرسکیں اور بعض پودوں کو زیادہ روشنی درکار نہیں ہوتی ہے تو اس پودے کو موٹے اور بھدے پتے دیئے گئے ہیں۔ (۹) بعض پتوں پر

کانٹے ہوتے ہیں اور بعض پتوں پر زہر ہوتا ہے تاکہ پتے محفوظ رہیں۔

(۱۰) اس طرح پتوں کی مختلف شکلوں کی وجہ سے کائنات میں حسن (Variety) پیدا ہوتی ہے۔

غرض ہر پتا خدا کی قدرت، عظمت، حکمت کا ایک دفتر ہے۔ خدا کی قدرت اور حکمت کے ارب در ارب کارخانے خاموشی سے اپنا اپنا کام کررہے ہیں۔ ساڑھے نو کروڑ میل کے فاصلے سے سورج کی کرنیں آتی ہیں جو بخارات کو اپنے کندھوں پر اٹھا کر لاتی ہیں پھر بجلیاں چمک کر زمین کی نس نس میں خون حیات دوڑاتی ہیں۔ بوندیں فضا میں نائٹروجن کا قیمتی خزانہ لے کر ہمارے کھیتوں کو پہنچاتی ہیں۔ تب جا کر ہماری غذا کا ایک لقمہ تیار ہوتا ہے۔ خدا فرماتا ہے۔

"ذرا اپنی غذا پر تو غور کرو۔ ہم نے پہلے بارش برسائی، پھر زمین کا پیٹ چیرا اور اس سے غلے، انگور، ترکاری، زیتون، کھجوریں، گھنے باغات، پھل، چارہ پیدا کیا۔ یہ سب چیزیں تمہارے لئے اور تمہارے حیوانات کے لئے زندگی کا سامان ہیں۔" (قرآن)

کتنی عجیب بات ہے کہ ہر بیج میں دو گرہیں ہوتی ہیں جن میں سے ایک سے ڈنڈی بن کر باہر نکلتی ہے اور دوسری جڑ بن کر زمین میں پیوست ہو جاتی ہے۔ آپ بیج کو کسی بھی زاویے سے زمین میں دبائیں، جڑ والی گرہ اوپر اور دوسری گرہ نیچے چلی جائے گی یہ کیوں؟ کوئی نگاہ ضرور ہے جو اس

کی رہنمائی کر رہی ہے۔ خدا فرماتا ہے۔

"زمین اور آسمانوں میں ایک ذرہ یا اس سے بھی کم کچھ بھی اللہ سے غائب نہیں رہتا۔" (سبا۔۳)

نیز فرمایا۔ "اللہ کا تخت سلطنت (حکومت) زمین اور آسمانوں پر چھایا ہوا ہے۔ خدا ان کی نگرانی سے گھبراتا نہیں۔ (یعنی خدا اگر اپنی نگرانی کو ڈھیلا کردے تو ہر جگہ بد نظمی پھیل جائے) خدا ہر لحاظ سے بلند و بالا ہے اور بہت عظیم ہے"۔ (بقرہ۔۲۵۵)

اب ذرا بیج کو دیکھئے کہ وہ نباتات کے انڈے ہیں اس لئے حفاظت کی خاطر انہیں غلافوں، حجابوں اور سخت قسم کے کھیسوں میں چھپا کر رکھا جاتا ہے۔ خاص کر جو بیج انسان کی غذا بنتے ہیں وہ زیادہ محفوظ کئے گئے ہیں۔ مثلاً مٹر، لوبیا، بادام، اخروٹ، چلغوزہ وغیرہ مگر ان کی اتنی زیادہ حفاظت بھی نہیں کی گئی کہ لاڈلے انسان کو نکالنے میں زیادہ زحمت ہو۔ مگر دوسرے مفید درختوں مثلاً سیب، سنگترہ، مالٹا وغیرہ کے بیج تعداد میں کم تھے اس لئے ان کو کڑوا یا کھٹا بنایا تاکہ انسان ان کو کھا نہ جائے اور اس طرح ان کی نسل ضائع ہو جائے۔ لیکن جو بیج ہماری روزمرہ کی غذا تھے مثلاً گندم، مکئی، جو، باجرہ وغیرہ تو خدا نے ان کو بکثرت پیدا کیا تاکہ خوب استعمال کے بعد بھی کچھ نہ کچھ بچے رہیں تاکہ لوگوں کو غذا ملتی رہے۔

پھولوں کو رنگ و بو اسلئے دیا تاکہ کائنات میں حسن پیدا ہو تاکہ خدا

کے حسن وجمال کا مظاہرہ ہو' اور یہ بھی کہ بھنورے اور مکھیاں ان کی طرف کھنچیں تاکہ پھولوں کی نسل چلتی رہے۔ ان مکھیوں اور بھنوروں کے ذریعہ پھولوں کے بیج نر سے مادہ کی طرف منتقل ہوتے ہیں اور جب یہ کام پھولوں کی نسل پھیلانے کا ہو چکے تو پھول مرجھا جائیں۔ بس ہو چکی نماز مصلیٰ اٹھایئے۔

پھر پھلوں کو جنگلی جانوروں سے اور پرندوں سے محفوظ رکھنے کے لئے قدرت نے یہ انتظام کیا کہ بعض پھلوں کے چھلکے بہت سخت بنائے' کچھ پر کڑوا غلاف چڑھادیا جیسے سنگترے اور انار کا چھلکا بے حد کڑوا بنایا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چھلکوں اور دانوں کو بنانے کے الگ الگ کارخانے کام کررہے ہیں اور حساب دان ماہرین اس کا انتظام کررہے ہیں۔ ایک کارخانہ مٹھاس بنارہا ہے دوسرا کڑواہٹ بنارہا ہے' پھر کتنی عجیب بات ہے کہ یہ سب کچھ ایک ہی مٹی اور ایک ہی پانی اور ایک ہی تنے اور شاخ سے ہورہا ہے۔ اس قدر دقیق' پیچیدہ پر حکمت صناعی اور حسن انتظام کی جتنی داد دی جائے' وہ کم ہوگی۔ خدا نے خود فرمایا۔

"دو دریا (ایک کڑوا' ایک میٹھا) پاس پاس بہہ رہے ہیں لیکن ان کے درمیان ایک ایسی دیوار حائل ہے جسے پھلانگ کر وہ ایک دوسرے سے غلط ملط نہیں ہوسکتے۔" (رحمان ۱۹'۲۰)

اخروٹ اور بادام اونچے پہاڑوں پر پیدا ہوتے ہیں جہاں برف وغیرہ

کی وجہ سے میدانی جانور نہیں پہنچ سکتے۔ وہاں صرف گلہری اور چوہوں کا خطرہ ہے۔ اس لئے ان کے چھلکے اتنے سخت بنادیئے تاکہ چوہے اور گلہریاں نقصان نہ پہنچاسکیں۔ پھر ان پھلوں کے بیجوں کو ہوائیں اڑاکر دور دراز ملکوں میں لے گئیں یا دریاؤں اور برساتی نالے ان کے بیجوں کو بہاکر دوسری زمینوں پر لے گئے۔ اس طرح یہ پھل عام ہوئے۔ بھڑوں اور کیڑوں کو اس کام پر متعین کیا کہ وہ غنچوں میں سے انڈے لے کر مادہ پھولوں پر جاکر ڈال دیں۔ یہی فطرت کی رنگینیاں جو خدا کی قدرت، عظمت، حکمت، نظامت، فہم وفراست کی کھلی ہوئی دلیلیں ہیں۔ بقول اقبال

حسن بے پروا کو اپنی بے حجابی کے لئے
ہوں اگر شہروں سے بن پیارے، تو شہر اچھے کہ بن؟

کھجور کے درختوں کو اونچا بنایا تاکہ زمین کی گرمی سے پھل محفوظ رہے، جانور نہ کھاسکیں۔ تنے اس لئے ریشہ دار اور کھوکھلے بنائے تاکہ تھرماس بوتل کی طرح اندر کی ہوا بیرونی حرارت سے متاثر نہ ہوسکے اور پھل گرمی کی وجہ سے خشک نہ ہوجائے، پھر کھجور کیونکہ جنگل میں اگتی ہے اس لئے قدرت نے اس پر ایسا کچھ مسالہ لگادیا ہے کہ مہینوں خراب نہیں ہوتی۔ کھجور کی جڑ دو قسم کے رس چوستی ہے۔ کثیف اور لطیف۔ کثیف رس سے تنا، پتے اور شاخیں بنتی ہیں اور لطیف رس سے پھل بنتا ہے۔ ہر کھجور کے دانے کے ساتھ ایک مصفی لگا ہوتا ہے جو رس کو خوب صاف

کرتا ہے لیکن گھٹلی پھر بھی کڑوی رہتی ہے اور چھلکا میٹھا رہتا ہے۔ ان دونوں کے درمیان ایک پردہ لگا رہتا ہے تاکہ مٹھاس کڑواہٹ سے مل کر خراب نہ ہو جائے۔ (سبحان اللہ) خدا فرماتا ہے۔

"زمین کو لوگوں کے رہنے بسنے کے لئے بنایا گیا ہے (اسلئے) اس میں طرح طرح کے میوے اور گچھے والی کھجوریں ہیں۔" (رحمان-۱۱)

عرب سندھ پر قابض ہوئے تو ان کے پاس کھجوریں تھیں جہاں جہاں اترے گھٹلیاں پھینکتے گئے' نتیجہ یہ ہوا کہ آج بھی سندھ میں عربی نسل کی کھجوریں میلوں تک دکھائی دیتی ہیں۔

ابھی اس راہ سے گزرا ہے کوئی
خبر دیتی ہے شوخی نقش پا کی

پھر ان درختوں کے عجائبات بے حد و بے حساب ہیں۔ مثلاً مولی' شلغم' پیاز کے پتے اس طرح بنائے گئے کہ جب بارش برستی ہے تو یہ پتے قطروں کو سمیٹ کر جڑ میں ڈال دیتے ہیں جبکہ انجیر' کھجور اور آم کے پتے پانی کو پھیلا پھیلا کر گراتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ مولی شلغم وغیرہ کی جڑ صرف ایک ہوتی ہے اس لئے پتے سارے کا سارا پانی جڑ پر گراتے ہیں اور آم کھجور اور انجیر وغیرہ کی جڑیں زمین میں پھیلی ہوتی ہیں اس لئے ان کے پتے پانی پھیلا پھیلا کر گراتے ہیں تاکہ زیادہ سے زیادہ جڑیں سیراب ہوں۔

یا مثلاً سنڈیو کا پھول جس زمین پر پیدا ہوتا ہے اس زمین میں

نائٹروجن نہیں ہوتی۔ اس لئے اس پھول پر ایک لیس دار رس نکلتا ہے جوں ہی کوئی مکھی اس کی مٹھاس کی وجہ سے اس پر بیٹھتی ہے' پھول کی پتیاں اس پر پل پڑتی ہیں اور اسے کھا جاتی ہیں اس طرح نائٹروجن کی اپنی کمی کو پورا کر لیتی ہے۔

اسی طرح تھیلی دار پودے ہوتے ہیں جن کی ٹہنیوں کے ساتھ چھوٹی چھوٹی تھیلیاں ہوتی ہیں۔ یہ تھیلیاں چوہے کے پنجرے کی طرح صرف باہر کی طرف کھلتی ہیں۔ جب کیڑے مکوڑے اپنے آرام یا غذا حاصل کرنے کے لئے ان تھیلیوں میں جاتے ہیں تو گرفتار ہو کر پودے کی غذا بن جاتے ہیں۔

اسی طرح ایک پودے Pitcher Plant کے پھول صراحی کی طرح شاخوں میں لٹکے ہوتے ہیں۔ ان کے اندر میٹھا رس ہوتا ہے اور دیواروں کے ساتھ ٹیڑھے کانٹے ہوتے ہیں۔ جب کوئی کیڑا ان کا رس پینے کے لئے اندر داخل ہوتا ہے تو واپسی پر کانٹے اس کا راستہ روکنے لگتے ہیں۔ وہ بار بار چڑھتا اترتا' گرتا' سنبھلتا ہے اور اس طرح تھک جاتا ہے اور پودا اس کو اپنی غذا بنالیتا ہے۔ غرض شیخ سعدی نے کیا خوب فرمایا

برگ درختاں سبز در نظر ہوشیار
ہر ورقی دفتر ایست معرفت کردگار

فلسفہ توحید

توحید ذاتی' توحید صفاتی و توحید افعالی

توحید ذاتی

فلاسفۂ اسلام کے نزدیک توحید ذاتی کے معنی یہ ہیں کہ خدا کی ذات میں کسی کو شریک نہ مانا جائے۔ خدا نہ تو اندرونی طور پر کسی چیز سے مرکب ہے اور نہ اس کی ذات سے خارج کوئی الگ چیز خدا کی شریک ہے۔ خدا ایک بسیط ذات ہے جو ہر قسم کے اجزاء اور اعضاء سے پاک' اکیلی اور لاشریک ہے۔

عرفاء کے نزدیک توحید ذاتی یہ ہے کہ انسان یہ بات سمجھ لے کہ وجود بس خدا کی ذات میں منحصر ہے۔ کائنات میں جو کچھ بھی نظر آتا ہے سب خدا کا جلوہ ہے اور اس کے وجود کا عکس ہے۔ گویا ساری کائنات آئینے ہیں اور ہر آئینہ میں خدا کا وجود جلوہ گر ہے۔ کائنات کی تمام کثرتیں صرف آئینوں کی کثرتیں ہیں۔ گویا ڈھیر سارے آئینے بکھرے پڑے ہیں اور سارے کے سارے آئینوں میں بس ایک نور جلوہ گر ہے۔ یعنی یہ آئینے خود کچھ نہیں ہیں' یہ صرف خدا کے نور کے جلوہ گاہ ہیں۔ قرآن میں خدا نے فرمایا۔

"اللہ نور السموات والارض یعنی "اللہ تمام آسمانوں او زمینوں کا نور

ہے۔ اس کے نور کی مثال ایسی ہے کہ جیسے کسی فانوس میں چمکتا ہوا چراغ روشن ہو"۔

عرفاء جب یہ کہتے ہیں کہ ہم خدا کے سوا کچھ نہیں دیکھتے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ جن چیزوں کو ہم دیکھ رہے ہیں وہ سب خدا ہیں بلکہ مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہم ان تمام چیزوں کے آئینوں میں خدا کو جسے وہ معشوق حقیقی کہتے ہیں' اس کا جلوہ اور جمال و کمال دیکھتے ہیں۔ شیخ سعدی" نے کہا۔

ہر ورقی دفتر ایست معرفت کردگار

میر انیس نے کہا۔

ہر رنگ میں جلوہ ہے تیری قدرت کا
جس پھول کو سونگھتا ہوں بو تیری ہے

توحید صفاتی

علم کلام یا فلاسفۂ اسلام کے ماہرین کے نزدیک توحید کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی صفات' خدا کی ذات سے الگ چیز نہیں بلکہ عین ذات ہیں۔ یعنی خدا کی صفات کا الگ سے کوئی وجود نہیں جیسے ہم کسی کالی چیز پر سفید رنگ کردیتے ہیں۔ اس طرح خدا کی صفات خدا سے نہیں چپکا دی گئی ہیں یا جیسے ہم بے علم ہوتے ہیں پھر علم حاصل کرکے عالم بن جاتے ہیں۔ غریب ہوتے ہیں مال کما کر خوشحال ہو جاتے ہیں۔ یہ اس لئے ہے کہ ہمارا نفس

الگ چیز ہے اور علم الگ چیز ہے۔ ہمارا نفس الگ ہے اور مال الگ چیز ہے۔ ہمارے تمام صفات ہماری ذات سے الگ ہیں۔ مگر خدا کے یہاں ایسا نہیں۔ خدا کا علم' خدا کی قدرت یا خدا کی تمام دوسری صفات' خدا کی ذات سے الگ کوئی چیز نہیں۔ کیونکہ خدا کی ذات ایک بسیط ذات ہے۔ خدا کا کوئی کمال اس کی ذات سے الگ چیز نہیں۔ خدا کا علم و قدرت کوئی الگ چیز نہیں جو بعد میں خدا سے ملا دی گئی ہو یا بڑھ کر خدا سے مل گئے ہوں۔ اسی کو توحید صفاتی کہتے ہیں۔ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا۔ نفی الصفات عنہ یعنی توحید یہ ہے کہ ہم یہ مان لیں کہ خداوندعالم اپنی ذات سے الگ صفت کا حامل نہیں۔ کیونکہ اگر خدا کی صفات کو خدا کی ذات سے الگ مانا جائے گا تو ایک قسم کا تعدد پیدا ہو جائے گا۔ یعنی خدا کی ذات الگ ہوگی اور اس کا علم الگ ہوگا۔ اس کی قدرت الگ ہوگی۔ یہ بات توحید کے خلاف ہے۔

عرفاء کے نزدیک توحید صفاتی یہ ہے کہ کائنات میں تمام صفات کمالیہ و جمالیہ ہمیں صرف خدا کی صفات نظر آنے لگیں۔ ہر صفت کمال خدا کی صفت نظر آئے۔ یعنی وہ یہ دیکھنے لگے کہ خدا کے سوا حقیقتاً" کسی کے پاس نہ کوئی علم ہے نہ قدرت اور نہ کوئی کمال ہے۔ علم اور قدرت سب حقیقتاً" صرف اللہ کے لئے ہے۔ لوگوں کے پاس جو علم و قدرت یا کوئی کمال ہے وہ ایک ناچیز سایا یا پرتو کی حیثیت رکھتا ہے۔ علم قدرت طاقت

اختیار کمال جمال بنیادی طور پر بس خدا کے لئے ہے۔ ہر کمال و جمال خدا ہی کی قدرت کے کمال و جمال کے جلوے ہیں جو مظاہرہ کائنات میں جلوہ گر ہو گئے ہیں۔ غرض یہ سب جمال و کمال حقیقتاً" خدا کی عطا اور جلوؤں کے سوا کچھ نہیں۔ اس لئے تمام صفات کمالیہ اور جمالیہ دراصل خدا کی صفات ہیں۔ عرفاء کا دعویٰ ہے کہ اس بات کو پوری طرح عقل سے نہیں سمجھا جاسکتا۔ ہم خدا کی عبادت اور دعا میں غرق ہو کر اپنے اندر صفائے روح پیدا کرلیں' تب ان حقائق کو دیکھ سکتے ہیں یا محسوس کرسکتے ہیں۔ یہ سننے کی نہیں چکھنے کی چیز ہے۔ غرض توحید صفاتی' مسلمان فلاسفہ اور عرفاء کے نزدیک الگ الگ معنی رکھتی ہے۔ فلاسفۂ اسلام کے نزدیک خدا کے صفات خدا کی ذات سے الگ نہیں۔ مگر وہ یہ نہیں کہتے کہ کمال کی ہر صفت چاہے کہیں بھی ہو' خدا کی صفت ہے۔ جبکہ عرفاء کے نزدیک ہر کمال بنیادی طور پر خدا ہی کی صفت ہے اور اسی صفت کا عکس یا سایہ ہمیں کائنات میں دکھائی دیتا ہے۔ بقول میر انیس۔

ہر رنگ میں جلوہ ہے تیری قدرت کا
جس پھول کو سونگھتا ہوں بو تیری ہے

عرفاء کہتے ہیں کہ اس حقیقت کو پالینے کے بعد انسان کو اس قدر لذت محسوس ہوتی ہے کہ وہ خود سے بے خود ہوجاتا ہے۔

توحید افعال

فلاسفۂ اسلام اور متکلمین کی اصطلاح میں توحید افعال سے مراد یہ ہے کہ خدا اپنے افعال میں کسی کی مدد یا مشورہ کا محتاج نہیں ہے۔ وہ ہر کام صرف اپنی مرضی سے تنہا بغیر کسی مداخلت' مدد یا مشورے کے انجام دیتا ہے۔ البتہ کبھی وہ بغیر وسائل و اسباب کے کوئی کام انجام دیتا ہے اور کبھی وسائل کے ذریعے سے انجام دیتا ہے۔ مگر یاد رہے وسائل بھی خود خدا ہی کی پیداوار ہیں اور وہ وسائل کا محتاج بھی نہیں۔ ایسا ہرگز نہیں کہ وہ وسائل کے بغیر کوئی کام انجام ہی نہیں دے سکتا۔ جب خدا چاہتا ہے تو کسی مصلحت کی بناء پر اسباب کے ذریعہ کام انجام دیتا ہے اور جب چاہتا ہے بغیر وسائل کے انجام دیتا ہے۔

عرفاء کے نزدیک توحید افعالی کا مطلب یہ ہے کہ جب کسی شخص کے دل یا روح میں طہارت اور پاکیزگی پیدا ہوجاتی ہے تو وہ ہر کام کو خدا کا کام سمجھتا ہے۔ دوسرے تمام کام کرنے والے اس کی نگاہ میں ایک وسیلہ کے سوا کچھ نہیں ہوتے۔ اس فلسفے کی ناقص مثال یہ ہے کہ جیسے قلم کسی لکھنے والے کے ہاتھ میں ہو۔ قلم لکھتا ضرور ہے لیکن وہی کچھ لکھتا جو لکھنے والا چاہتا ہے۔ اصل لکھنے والا مصنف ہوتا ہے' قلم نہیں ہوتا۔ عرفاء کہتے ہیں کہ جب انسان خدا کی اطاعت' اس کی خوشی اور عبادت کو پورے طور پر اختیار کرلیتا ہے تو پھر اسے خدا کی جانب سے ایک نور عطا کیا جاتا

ہے۔ پھر جب وہ کائنات کو دیکھتا ہے تو اسے صاف صاف' صرف اور صرف ایک خدا کا ہاتھ دکھائی دیتا ہے جو ہمیشہ ہر جگہ ہر کام انجام دیتا ہے۔ پھر وہ یہ حقیقت پالیتا ہے کہ طاقت' علم' کمال' جمال سب صرف اور صرف خدا کے پاس ہیں اور دوسرے لوگ سوا وسیلے یا پرزے کے اور کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔

یہ بات جان لینے کے بعد انسان کسی انسان یا دوسری طاقت کے تسلط کو اپنے اوپر قبول نہیں کرتا۔ یہی توحید کا حقیقی مفہوم ہے کہ انسان' انسان کی بندگی نہ کرے بلکہ ہر بندھن سے آزاد ہو کر صرف اور صرف خدا کی بندگی کرے۔ بقول ڈاکٹر اقبال۔

یہ ایک سجدہ' جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

یہی مفہوم ہے کلمہ لا الہ الا اللہ کا' اگر یہ کلمہ صرف اور صرف بے جان بتوں کے خلاف ہوتا تو تاریخ میں اتنی معرکہ آرائی نہ دکھائی دیتی۔ اگر رسول خدا صرف کعبہ کے بتوں کے خلاف ہوتے اور کعبہ کے ٹھیکیداروں کے مفادات کے خلاف نہ ہوتے تو قریش کے سرمایہ دار سردار رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف سردھڑ کی بازی نہ لگاتے۔ وہ بتوں کو چھوڑ کر کعبہ کی چابی کے اسلامی متولی بن جاتے۔ یعنی خادم الحرم کا لقب اختیار کرلیتے اور عرب پر حکومت کرتے رہتے۔ یعنی اسلام کا لبادہ

اوڑھ کر سرمایہ داری اور استکباری کرتے۔ لیکن لا الہ الا اللہ کے حقیقی معنی ہی یہ ہیں کہ ہم کسی کو خدا کے سوا بڑی طاقت نہیں مانتے۔ آج مٹی پتھر کے بت تو نہیں رہے لیکن بڑی طاقتوں کے نام سے اور سرمایہ داروں کے لبادہ میں حکومتیں اور افراد موجود ہیں جو انسانوں کے سروں پر دندنا رہے ہیں۔ انسانی وسائل کو اپنی مٹھی میں لیکر ہر قوم کو اپنی اطاعت پر مجبور کر رہے ہیں۔ توحید کا سچا پرستار کبھی کسی طاقت کو جو خدا کے علاوہ ہو، قبول نہیں کرتا۔ بقول اقبال۔

ماسوای اللہ را مسلماں بندہ نیست
پیش فرعونی سرش افگندہ نیست

یعنی اللہ کے سوا مسلمان کسی کا غلام نہیں۔ کسی فرعون کے سامنے اس کا سر نہیں جھک سکتا۔

اور یہ فلسفہ حضرت امام حسین علیہ السلام نے کربلا میں سکھا دیا۔

تیغ لا چوں از میاں بیروں کشید
از رگ ارباب باطل خوں کشید

یعنی جب امامؑ نے لا الہ کی تلوار میان سے نکالی تو انہوں نے باطل خداؤں کی رگوں سے خون نکال لیا۔

سورہ انعام (۷۴ تا ۸۳ آیات)

"ابراہیمؑ کا واقعہ یاد کرو کہ جب انہوں نے اپنے باپ (مراد چچا) آذر سے کہا کہ کیا تم بتوں کو خدا سمجھتے ہو؟ میں تمہیں اور تمہاری قوم والوں کو کھلی ہوئی گمراہی میں دیکھ رہا ہوں(۷۴) اسی طرح ہم نے ابراہیمؑ کو آسمانوں اور زمین کا نظام سلطنت دکھایا تاکہ وہ یقین رکھنے والوں میں سے ہوں(۷۵) تو جب رات کا اندھیرا ان پر چھا گیا تو انہوں نے ایک تارا دیکھا۔ تو کہا یہی میرا پالنے والا مالک ہے، مگر جب وہ تارا ڈوب گیا تو انہوں نے کہا "میں ڈوبنے والوں سے محبت نہیں کرتا" پھر جب چاند کو چمکتے دیکھا تو کہا "لو یہ ہے میرا پالنے والا مالک!" مگر جب وہ بھی ڈوب گیا تو کہا: اگر میرا حقیقی پالنے والا مالک مجھے سیدھے راستے پر نہ رکھتا، تو میں گمراہ لوگوں میں سے ہو جاتا(۷۷) پھر جب سورج کو چمکتے دیکھا تو کہا "بس یہی ہے میرا پالنے والا آقا" (کیونکہ) یہ تو سب سے بڑا ہے" مگر جب وہ بھی ڈوب گیا تو ابراہیمؑ پکار اٹھے "اے میری قوم والو! یقین جانو کہ میں ان (جھوٹے خداؤں) سے قطعی بیزار اور الگ ہوں جن کو تم خدا کا شریک ٹھہراتے ہو(۷۸) میں نے تو ہر چیز اور ہر طرف

سے ہٹ کر اور کٹ کر، اپنا چہرہ صرف اسی ہستی کی طرف موڑ لیا ہے جس نے زمین و آسمانوں کو پیدا کیا ہے اور میں ہرگز شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں" (۷۹) اس پر ان کی قوم ان سے جھگڑنے لگی۔ تو انہوں نے اپنی قوم سے کہا "کیا تم اللہ کے معاملے میں جھگڑتے ہو؟ حالانکہ اس نے تو مجھے سیدھا راستہ دکھایا ہے (اس لئے) میں ان چیزوں سے بالکل نہیں ڈرتا جنہیں تم نے خدا کا شریک ٹھہرا دیا ہے۔ سوا اس کے کہ اگر میرا حقیقی مالک ہی کوئی بات (یعنی میرا نقصان) چاہے۔ میرے پالنے والے آقا کا علم ہر چیز پر چھایا ہوا ہے۔ آخر تم ہوش میں کیوں نہیں آتے؟(۸۰) آخر میں تمہارے ٹھہرائے اور بنائے ہوئے خدا کے شریکوں سے کیوں ڈروں؟ جبکہ تم لوگ تو خدا کے ساتھ شریک ٹھہرانے (جیسے عظیم جرم سے بھی) نہیں ڈرتے؟ جن کے متعلق خدا نے تم پر نہ تو کوئی دلیل اتاری ہے اور نہ کوئی سند اتاری ہے۔ تو (بتاؤ) ہم دونوں فریقوں میں سے کون ہے، جو امن و سکون کی حالت میں مطمئن رہنے کا زیادہ حقدار ہے؟ (بتاؤ) اگر تم کچھ بھی علم رکھتے ہو؟(۸۱) حقیقت یہ ہے کہ امن و سکون (Peace of mind) تو صرف

انہیں لوگوں کے لئے ہے اور ٹھیک سیدھے اور صحیح راستے پر بھی وہی لوگ ہیں جو خدا کو دل سے مانتے ہیں' اور پھر اپنے اس ماننے میں ظلم (یعنی شرک) کی ملاوٹ بھی نہیں کرتے(۸۲) یہ ہماری وہ دلیل ہے جو ہم نے ابراہیمؑ کو ان کی قوم کے مقابلے پر عطا کی تھی۔ ہم جسے چاہتے (دلیلیں سکھا کر) درجوں میں بلندی عطا کرتے ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ تمہارا پالنے والا مالک گہری مصلحتوں اور حقیقتوں کے مطابق دانائی کے ساتھ بالکل ٹھیک ٹھیک کام کرنے والا بھی ہے اور سب کچھ جاننے والا بھی(۸۳)

تشریح :

(۱) مطلب یہ ہے کہ جس طرح ہم نے تم لوگوں کو کائنات کے آثار نمایاں طور پر دکھائے ہیں اور اپنی نشانیاں بھی تمہیں دکھائی ہیں' اسی طرح ابراہیمؑ کے سامنے بھی یہی آثار تھے اور یہی نشانیاں تھیں۔ یہی خدا کے آثار تھے مگر تم ان کو دیکھتے ہوئے بھی اندھوں کی طرح کچھ نہیں دیکھتے۔ مگر ابراہیمؑ نے ان آثار کائنات کو آنکھیں کھول کر دیکھا۔ یہی چاند سورج' یہی ستارے تمہیں جیسا طلوع ہوتے ہوئے گمراہ پاتے ہیں ویسا ہی غروب ہوتے وقت گمراہ اور خدا سے غافل چھوڑ جاتے ہیں۔ انہیں چیزوں کو یعنی کائنات کے بند و بست کو اس آنکھ والے انسان ابراہیمؑ نے بھی دیکھا تھا۔

مگر وہ ان نشانیوں کو دیکھ کر حقیقت تک پہنچ گئے مگر تم نہ پہنچے۔ بقول اقبال

دل بینا بھی کر خدا سے طلب
آنکھ کا نور دل کا نور نہیں

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مرد نادان پر کلام نرم و نازک بے اثر

بقول میر انیس۔

ہر سو تیری قدرت کے ہیں لاکھوں جلوے
حیراں ہوں کہ دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں؟

ما و مجنوں ہم سبق بودیم در ایوان عشق
او بصحرا رفت مادر کوچہ ہا رسوا شدیم

یعنی ہم اور مجنوں عشق کے مدرسے میں ساتھ ساتھ پڑھتے تھے۔ وہ تو صحرا میں نکل گیا اور ہم گلیوں میں ذلیل و خوار مارے مارے پھر رہے ہیں۔

غرض اس آیت نے خدا کے بارے میں تفکر و تدبر کا طریقہ سمجھایا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کے اردگرد پوری قوم چاند سورج اور ستاروں کو خدا سمجھ کر پوج رہی تھی اس لئے فی الحقیقت حضرت ابراہیمؑ کے زمانے کے لوگوں کی جستجو کا آغاز اس سوال سے ہونا چاہئے تھا کہ کیا واقعی یہی خدا

ہیں۔ اس سوال کا جواب انہوں نے اس طرح دیا کہ یہ چاند سورج اور ستارے تو کسی کے غلام ہیں جو غلاموں کی طرح گھوم رہے ہیں۔ ان میں کوئی خدا کی صفت بھی موجود نہیں۔

حضرت ابراہیمؑ کا چاند سورج تارہ کو یہ کہنا کہ "یہ میرا رب ہے" صرف یہ بات بتلانے کے لئے تھا کہ طالب حق اپنی جستجو کی راہ میں جن جن منزلوں پر غور کرنے کے لئے رکتا ہے' اصل اعتبار ان منزلوں کا نہیں ہوا کرتا۔ بلکہ اصل اعتبار اس سمت کا ہوتا ہے جس کی طرف وہ بڑھ رہا ہوتا ہے اور اس آخری مقام کا ہوتا ہے جہاں وہ پہنچتا ہے۔ کیونکہ اصل میں یہ ٹھہراؤ سوالی اور استفہامی ہوا کرتا ہے نہ کہ حکمی۔

طالب حق کی یہ درمیانی راہ میں غور و فکر اس کی آخری رائے نہیں ہوا کرتی۔ جب تحقیق (Research) پر اس کو جواب نفی میں ملتا ہے تو وہ آگے بڑھ جاتا ہے۔ اس لئے طالب حق کے لئے یہ سمجھنا کہ درمیان راہ میں جہاں جہاں اس کو تحقیق کے لئے رکنا پڑتا ہے وہاں وہ عارضی طور پر کافر یا مشرک ہوجاتا ہے، بالکل غلط ہے (اور حضرت ابراہیمؑ تو یہ سب کچھ صرف اپنی قوم کو سمجھانے کے لئے فرما رہے ہیں اور اپنی قوم کو تفکر و تدبر کا طریقہ بتا رہے ہیں)۔ (تفہیم)

بقول ڈاکٹر اقبال ؎

اگرچہ بت ہیں جماعت کی آستینوں میں

مجھے ہے حکم اذاں لا الہ الا اللہ

یہ نغمہ فصل گل و لالہ کا نہیں پابند
بہار ہو کہ خزاں' لا الہ الا اللہ

انسان جتنا آسمانوں اور زمیں کے نظام سلطنت کو دیکھتا ہے' غور کرتا ہے' تو گویا ہو اس عبادت کو انجام دیتا ہے جو حضرت ابراہیمؑ کی عبادت تھی۔ کیونکہ خدا نے فرمایا کہ "ہم نے ابرہیمؑ کو آسمانوں اور زمین کا نظام سلطنت دکھایا"۔

خدا ایسے بندوں کا قصیدہ پڑھ رہا ہے جو اٹھتے بیٹھتے' سوتے (جاگتے) خدا کے کاموں سے غافل نہیں رہتے۔ جو کائنات ارض و سماء پر غور کرنے کے بعد یہ اعلان کرتے ہیں کہ "اے رب دنیا میں کوئی چیز بلا مقصد پیدا نہیں کی گئی' تو ہر عیب سے پاک ہے۔ ہمیں جہنم کی آگ کی سزا سے بچالے"۔

غرض اللہ کا سب سے بڑا معجزہ تخلیق کائنات ہے۔ اسی لئے ہر نبی نے اپنی قوم کو اللہ کی طرف بلاتے ہوئے خدا کے اعجاز تخلیق پر غور کرنے کی دعوت دی۔ مثلاً

"فرعون نے موسیٰؑ سے پوچھا کہ خدا کون اور کیا ہے؟ موسیٰؑ نے کہا وہی تو مالک ہے آسمانوں کا اور زمین کا۔ اور ان تمام چیزوں کا جو ان کے درمیان ہیں۔ اگر تم یقین کرنا چاہتے ہو تو (اس کے لئے کائنات پر غور

کرنا کافی ہے)" (شعراء ۲۳۔۲۴)

حضرت شعیبؑ نے فرمایا۔ "اس اللہ سے ڈرو جس نے تمہیں اور تم سے پہلے کی دیگر اقوام کو پیدا کیا۔" (شعراء ۱۸۴)

غرض جس طرح فضا میں بڑے بڑے آفتاب مختلف گزر گاہوں میں نہایت تندی اور تیزی سے گھوم رہے ہیں۔ بظاہر ان کی حرکات ایک دوسرے سے مختلف ہیں لیکن سب کے سب ایک ہی آئین اور ایک ہی اصول کے پابند ہیں۔ اسی طرح تمام انبیاء کرامؑ بعض فروعی اختلافات کے باوجود ایک ہی پیغام توحید کے علمبردار ہیں۔ سب کے سب خدا کی اطاعت کی دعوت دیتے ہیں۔ خدا نے فرمایا۔

"قسم ہے ان ہواؤں کی جو ذرات کو اڑاتی ہیں جو بادلوں کی ایک دنیا اٹھائے پھرتی ہیں۔ جو کسی روک ٹوک کے بغیر چلتی ہیں اور ہر طرف بارش کے قطرات تقسیم کرتی پھرتی ہیں کہ تم سے جو جو وعدے کئے گئے ہیں وہ پورے ہو کر رہیں گے۔ اور جزاء اور سزا کا آئین پورا ہو کر رہے گا۔ مختلف گزر گاہوں والے آسمان کی قسم کہ تم (انبیاء کی تعلیم کے بارے میں) خواہ مخواہ اختلاف کرتے ہو۔" (ذاریات ۱۔۸)

"امن و سکون خدا کو دل سے ماننے والوں کیلئے ہے۔

خدا کا فرمانا کہ "امن و سکون" (Peace of Mind) تو صرف ان لوگوں کے لئے ہے جو خدا کو دل سے مانتے ہیں۔ وہی ٹھیک اور صحیح راستے پر ہیں۔ پھر خدا کے ماننے میں ظلم (یعنی شرک) کی ملاوٹ بھی نہیں کرتے۔

اس حقیقت کی جدید علوم سے تشریح اس طرح کی جا سکتی ہے کہ جدید علم نفسیات کی تحقیقات کے مطابق جو فرائیڈ نے کی ہیں' انسان کے اندر ایک زبردست طاقت جذبہ لاشعور کی ہے جس کا مطالبہ حسن و کمال ہے۔ فرائیڈ لکھتا ہے کہ بچہ اپنے والدین سے اس لئے محبت کرتا ہے کہ وہ ان کو قابل تعریف سمجھتا ہے اور ہر کمال کو ان کی طرف منسوب کرتا ہے۔ بچہ اپنے استادوں سے بھی اس لئے محبت کرتا ہے کہ اس کی نظر میں وہ کمال کا ایک نمونہ ہوتے ہیں۔ لیکن عمر بڑھنے کے بعد اس کو معلوم ہوتا ہے کہ ان میں کافی نقائص ہیں۔ اس لئے اس میں آبائی الجھاؤ (Father Complex) پیدا ہوجاتا ہے۔ یعنی ماں باپ اِس کے جذبہ لاشعوری کے مطالبۂ حسن و کمال کو مطمئن نہیں کرسکتے۔ کیونکہ اب جذبہ لاشعور غیر متناہی حسن و کمال کا مطالبہ کرنے لگتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر انسان مرتے دم تک خوبی' جمال' کمال و عظمت کی محبت میں گرفتار رہتا ہے۔ بچپن میں یہ خواہش ماں باپ اور استادوں کی ذات میں اپنی تکمیل ڈھونڈتی ہے۔ کیونکہ اُن سے زیادہ کامل تر اور اعلیٰ تر شخص بچہ کے علم

میں نہیں ہوتی۔ مگر بچہ جیسے جیسے بڑا ہوتا جاتا ہے وہ بہتر اشیاء اور اشخاص کی محبت کی طرف اپنا رخ موڑتا چلا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ انسان کی فطرت میں انسان کے لاشعور میں طلب حسن و کمال کا جذبہ موجود ہے۔ انسان عمر بھر اس جذبہ کی تکمیل اور تشفی کے لئے کوششیں کرتا رہتا ہے۔ یہ جذبہ جو فوق الشعور کا مطالبہ ہوتا ہے صرف اور صرف اس وقت پوری طرح مطمئن ہوتا ہے جب انسان خدا کو پہچان کر اس کی محبت میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ اسلئے کہ غیر متناہی حسن و کمال خدا کے تصور کے سوا اور کسی تصور میں موجود نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ خدا کے سوا ہر چیز میں کوئی نہ کوئی نقص ضرور ہوتا ہے۔ ہیگل نے خدا کی تعریف ہی یہ کی ہے کہ "وہ ایک ایسی ہستی ہے جس کے حسن و کمال کی کوئی انتہاء نہیں"۔

فرائیڈ کے نظریہ میں سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ وہ فوق الشعور کو آبائی الجھاؤ کا قائم مقام اور اس کا نتیجہ سمجھتا ہے۔ حالانکہ اس دعوے کو وہ ثابت بھی نہیں کرتا مگر اس کے باوجود سارے نظریہ لاشعور کی بنیاد اپنی اسی غلطی پر رکھتا ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ والدین کی محبت بھی لاشعور کے جذبہ حسن و کمال کا نتیجہ ہے۔ فرائیڈ خود لکھتا ہے۔

"میں جس حد تک چاہتا ہوں آپ کو بتا نہیں سکتا کہ آبائی الجھاؤ فوق الشعور میں کس طرح سے تبدیل ہو جاتا ہے----- اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارا خیال ہے کہ ہم نے خود اس کو پوری طرح سے نہیں سمجھا ہے"۔

پھر وہ خود لکھتا ہے کہ "ہو سکتا ہے کہ فوق الشعور آبائی الجھاؤ کا نتیجہ نہ ہو۔ بلکہ فطرت انسانی کے ایک ایسے بنیادی خاصہ یا تقاضے کا نتیجہ ہو جو خود آبائی الجھاؤ کا سبب ہو" حقیقت یہ ہے کہ حسن و کمال سے محبت انسان کی فطرت کا ایک قدرتی وظیفہ ہے جو اس کے آبائی الجھاؤ کا نتیجہ نہیں بلکہ آبائی الجھاؤ اگر کوئی چیز ہے تو اسی حسن و کمال سے محبت کا نتیجہ ہے۔ اور فرائیڈ کا یہ خیال بھی غلط ہے کہ بچہ جنسی خواہشات کی وجہ سے ماں باپ سے محبت کرتا ہے۔ بچہ ماں باپ سے محبت بھی اسی لئے کرتا ہے کہ وہ ان کو حسن و کمال کا نمونہ سمجھتا ہے۔ البتہ جوانی میں خود شعوری کا جذبہ جو حسن کا متلاشی ہوتا ہے' اپنے مطلوب کو نہ جاننے کی وجہ سے آسانی سے بھٹک جاتا ہے۔ وہ بہت جلد جذبہ جنس کے راستے پر چل نکلتا ہے۔ وہ اپنا یہ جذبہ جنس مخالف میں ظاہر کرنے لگتا ہے۔ کیونکہ جوانی میں طلب جمال کا جذبہ جنسی جبلت کے ذریعہ سکون پانے کی کوشش کرتا ہے اور اگر اس کو اس میں ناکامی ہوتی ہے تو یہ جذبہ رک جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے انسان غمگین ہو جاتا ہے اسے ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ اگر جنسی عمل میں اس کو آزادی مل جائے تو یہی اس کی تمام پریشانیوں کا علاج ہے۔ لیکن حقیقتاً" جنسی بے راہ روی اس کے لئے مفید نہیں ہوتی نہ اس کو تسکین عطا کرسکتی ہے۔ اس لئے کہ اس کا رکا ہوا جذبہ جنسی لذتوں کے لئے نہیں ہوتا بلکہ حسن حقیقی تک پہنچنے کی لذت کے لئے ہوتا ہے کیونکہ

طلب حسن کا جذبہ لاشعوری ہے۔ اس لئے انسان کو اکثر یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ اس کی مکمل تسکین کس چیز سے ہوتی ہے۔ اس لئے وہ اکثر بڑی بڑی غلطیاں کرتا ہے۔ عشق مجازی کو عشق حقیقی سمجھنے لگتا ہے۔ بتوں کی محبت، وطن کی محبت، قوم کی محبت، ایکٹروں کی اور کھلاڑیوں کی محبت، حسینوں کی محبت، اپنی اولاد کی محبت، کرسی اور نام کی محبت، غلط تصورات کی محبت کو اور بعض دفعہ جنسی رفیق کی محبت کو تصور حسن یا اپنا آدرش (مقصد حیات) بنا لیتا ہے اور ان کے ذریعہ اپنے جذبہ حسن کو مطمئن کرنے لگتا ہے۔ مگر کیونکہ یہ تمام چیزیں تصور حسن یا صحیح آدرش (مقصد حیات) کی صفات سے عاری ہیں اور صحیح اور مکمل آدرش نہیں بن سکتے لہٰذا آخر کار خود شعوری کا جذبہ حسن اطمینان نہیں پاتا۔ اس لئے جذبہ خود شعوری کو بہت جلد مایوسی اور ذہنی پریشانی (Frustration) کا سامنا کرنا پڑتا ہے جو شدید اعصابی خلل یا ذہنی مجادلہ کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اس صورت میں ہم غلطی سے یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ اس مرض کا سبب جنسی جذبے کی رکاوٹ ہے۔ لیکن اس کا اصلی سبب خود شعوری کے جذبہ حسن کی رکاوٹ ہوتی ہے۔ اسی لئے جو لوگ جنسی محبت میں ناکام ہو جاتے ہیں، وہ اعلیٰ اخلاقی یا روحانی سرگرمیوں میں اطمینان محسوس کرتے ہیں اور آخر کار محبت کی ناکامیوں کو بھول جاتے ہیں۔ پھر ہمارا جذبہ حسن جنسی جذبے کی راہ سے اظہار نہیں پاتا۔ اور ہماری جنسی محبت غیر معمولی طور پر

طاقتور نہیں رہتی۔ ہم زندگی کا اصل لطف خدا کی محبت اور اطاعت میں اٹھاتے ہیں کیونکہ زندگی کی تمام چاشنی' لذت' رونق' شگفتگی ہماری خودشعوری کے جذبہ حسن کے سکون پانے میں ہوتی ہے۔

البتہ عورت کی مخلصانہ محبت سے آشنا ہو کر اس میں کامیاب یا ناکام ہو کر حسن مجازی کی ناپائیداری سے واقف ہو کر' انسان حسن حقیقی یعنی خدا کی محبت کی طرف راغب ہوتا ہے' تو وہ اس شخص کی نسبت بہت جلد کامیاب ہوتا ہے جو ایک شدید اور مخلصانہ محبت کے تجربے سے عمر بھر محروم رہا ہو۔ محبت کرنے والا شخص خدا کی محبت کا مزہ پا کر فوراً محسوس کرنے لگتا ہے کہ خدا کی محبت کی مسرت کئی گنا زیادہ گہری اور زیادہ روح افزا ہے جو رفتہ رفتہ عبادت کی وجہ سے بڑھتی ہی جا رہی ہے اور ہمیں زندگی مسرت اور قوت عطا کر رہی ہے۔ بڑی شدت و اخلاص سے محبت کرنا' خواہ مرجع محبت کوئی بھی ہو' ایک نہایت اعلیٰ درجے کی فعالیت ہے کیونکہ اس محبت کے ذریعہ ہم اپنے جذبہ حسن کا پورا پورا اظہار کر لیتے ہیں اور پھر کسی قسم کی محبت خود اپنی ہی تشفی اور تکمیل کے لئے زود یا بدیر لازماً" اللہ کی شدید محبت میں بدل جاتی ہے۔

خدا کی محبت کے حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ جنسی جذبے کو جذبہ حسن سے الگ کر کے جذبہ جنسی کو جذبہ حسن کے ماتحت کر دیا جائے۔ پھر دونوں کو موقع دیا جائے کہ وہ اپنا اپنا فطرتی اظہار پاتے رہیں۔ اس طرح

جبلت جنس اور جذبہ حسن دونوں اپنا اصلی مقام حاصل کرلیں گے اور ایک دوسرے سے تعاون کریں گے۔ جذبہ حسن کمال، حسن حقیقی، یعنی خدا کی محبت میں اپنا اظہار پائے گا۔ اور جبلت جنس اس کے ماتحت اس کا خدمت گزار بن کر رہے گا۔

اس طریقہ پر عمل کر کے انسان ہر قسم کے ذہنی مجادلے اور اعصابی امراض سے بھی محفوظ ہو جائے گا اور اس کا لاشعور پورا پورا سکون اور اطمینان پائے گا۔

اسی لئے خدا نے فرمایا۔

"ہوشیار، اللہ کی یاد ہی دلوں کو سکون بخشتی ہے"۔ (قرآن)

پریشانیوں کا راستہ اور اطمینان کے حصول کا طریقہ کار

ہم غلطی سے یہ سمجھ لیتے ہیں کہ جنسی خواہشات کی بے روک ٹوک سے ہم کامل آسودگی اور سکون حاصل کرلیں گے۔ لیکن تجربہ گواہ ہے کہ جنسی بے راہ روی ہمیں بالاخر سخت پریشان حال بنا دیتی ہے۔ کیونکہ جذبہ جنس اور چیز ہے۔ غلطی ہے یہ دونوں جذبے کچھ دیر کے لئے مل جل جاتے ہیں اور ہم جذبہ حسن کا بہت سا حصہ چھین کر جنسی خواہشات کے سپرد کر دیتے ہیں۔ لیکن ہمارا یہ جذبہ حسن و کمال ہمارے بے لگام جنسیت کے پیچھے موجود رہتا ہے۔ البتہ اس جذبہ حسن کمال کے ایک حصہ کی تشفی جنسی جذبے سے ہو رہی ہوتی ہے۔ پھر جب جنسی محبت اپنی تشفی پاکر کمزور

ہونے لگتی ہے تو آدرش یا حسن حقیقی کی محبت پھر اپنی اصل حالت پر لوٹتی ہے۔ لیکن وہ یہ پاتی ہے کہ اسے بے وفائی سے ترک کر دیا گیا ہے۔ ایسی حالت میں ذہنی مجادلہ نہایت شدید صورت اختیار کر جاتا ہے۔ جنسی خواہشات کی آزادانہ تسکین سے ہمارے اعصابی خلل اور بڑھ جاتے ہیں۔ ہم اندرونی طور پر خود کو بے اطمینان اور ناخوش محسوس کرتے ہیں کیونکہ ہمیں مکمل اطمینان اور سکون صرف اس وقت حاصل ہوتا ہے جب کوئی ذہنی مجادلہ موجود نہ ہو۔ اور جب ہمارا آدرش ہمارے جذبہ حسن کو پوری طرح مطمئن کر رہا ہو۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب ہم اپنے آدرش کے اندر کمال حسن کا احساس کر رہے ہوں یعنی جب ہم حسن حقیقی کے حسن و کمالات کا شعوری احساس اس طرح سے کر رہے ہوں کہ ہمارے لاشعوری جذبہ حسن کا کوئی حصہ غیر حسن کی طرف منتقل نہ ہو رہا ہو اور نہ ہو سکتا ہو۔ (قرآن اور علم جدید۔ ڈاکٹر محمد رفیع الدین)

خدا پر ایمان اور ذکر سے سکون قلب کسطرح ملتا ہے

سوال یہ ہے کہ انسان بے اطمینان کن وجوہات کی بناء پر ہوتا ہے؟ اس کی وجوہات معلوم ہوں تو معلوم ہوتا کہ "خدا پر ایمان اور خدا کا ذکر کس طرح سکون بخشتا ہے۔ انسان کی پریشانی کے آٹھ اسباب بتائے گئے ہیں۔

(۱) تاریک مستقبل یا نعمتوں کے چھٹ جانے کا غم' دشمنوں' بیماریوں' فقر

و فاقہ کا خوف' اس کے مقابلے کے لئے اگر ہمارے دل میں یہ ایمان و یقین ہو کہ خدا کی طاقت ہر طاقت سے قوی ہے۔ بقول شاعر؂

دشمن اگر قوی است' نگہباں قوی تر است

یعنی اگر دشمن طاقتور ہے' تو بچانے والا زیادہ طاقتور ہے۔

یہ عقیدہ اور یہ تصور کہ خدا نے ہماری کفالت اپنے ذمہ لی ہے اور وہ مشکلات اور پریشانیوں کا دور کرنے والا ہے۔ خدا کی ان صفات کی یاد اور یقین ہمیں ہر آنے والی مشکل اور حادثے اور خوف سے بچا لیتا ہے۔

(۲) انسان کی پریشانی کا دوسرا سبب ماضی کی تلخیاں ہیں۔ پچھلی غلطیوں کا انجام کا خوف اور اس کا مقابلہ کرنے کے لئے خدا کی یہ معرفت کہ وہ توبہ قبول کرنے والا ہے' گناہوں کا معاف کرنے والا اور پچھلے نقصانات پر اجر عظیم دینے والا ہے۔ یہ تصورات ہمیں ماضی کی ہر تلخی کو بھلا دیتے ہیں۔

(۳) انسان کی فطرت کے داخلی تقاضے خاص کر طلب حسن و کمال اگر سکون نہ پائے تو انسان مضطرب رہتا ہے کیونکہ اسکی فطرت آدرش کو چاہتی ہے۔ خدا کو مان کر اس کو یاد کرنے سے انسان کی یہ پیاس پورے پورے طور پر بجھ جاتی ہے۔

(۴) پریشانی کا ایک بڑا سبب زندگی کے بے مقصد ہونے کا احساس ہوتا ہے خدا کو ماننے کے بعد انسان کو زندگی کے معنی مل جاتے ہیں۔ زندگی کا

مقصد خدا کی رضامندی اور خدا کی عظیم نعمتوں کا حصول بن جاتا ہے پھر وہ بے ہدف ٹھکرائے ہوئے انسانوں کی طرح مارا مارا نہیں پھرتا بقول اقبالؒ ۔

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزاروں سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

(۵) پریشانی کا ایک سبب لوگوں کی ناقدریاں ہوا کرتی ہیں لیکن جب انسان خدا کو جان لیتا ہے تو اسے یقین ہوتا ہے کہ کوئی دوسرا میری نیکیوں کی قدر کرے یا نہ کرے خدا ہر حال میں میرا قدرداں ہے۔ اس لئے اسکو یہ خیال یا ایمان سکون بخشتا ہے۔

(۶) بدگمانیاں، دشمنیاں، بے ہودہ خیالات اور جھگڑے انسان کو بلا کی کوفت میں مبتلا کردیتے ہیں اگر انسان خدا کے احکامات پر عمل کرے گا تو کسی سے بدگمانی یا بے مقصد دشمنی یا چھوٹے موٹے فضول کے جھگڑے اور انا کے لئے دشمنیاں مول نہ لے گا۔

(۷) دنیا پرستی اور دوسروں کو مال ودولت عزت، اولاد ملتے دیکھ کر افسوس اور اضطراب پیدا ہوتا ہے مال عزت نہ ملنے پر دنیا پرست زندگی سے بیزار ہوجاتا ہے لیکن خدا کا سچا ماننے والا مال اولاد نام شہرت، عزت کو اتنی زیادہ اہمیت ہی نہیں دیتا کہ ان کے نہ ملنے پر تڑپنے لگے۔ وہ ان تمام نعمتوں کو خدا کی عطا پر موقوف سمجھتا ہے اور ان کو زندگی کا اصل

ہدف نہیں سمجھتا۔ وہ جائز کوششیں ضرور کرتا ہے مگر نہ ملنے پر ہر طرح مضطرب نہیں ہوتا۔ پھروہ جانتا ہے کہ خدا کا ہر کام کسی نہ کسی گہری مصلحت کی بناء پر ہوا ہے ممکن ہے کہ خدا نے مجھے ان چیزوں سے باوجود پوری کوششوں کے اس لئے محروم رکھا ہوا ہے کہ ان کے ملنے میں میرا ہی کوئی نقصان ہو اور خدا جب چاہے گا ان سے کہیں عظیم نعمتیں مجھے عطا فرمادے گا۔

(۸) پریشانی کا ایک سبب موت کا خوف ہوتا ہے لیکن ایک سچا خدا پرست انسان موت کو فنا نہیں بلکہ بقاء کا سبب سمجھتا ہے ملاقات رب سمجھتا ہے۔ موت کو اعلیٰ ترین زندگی کا دریچہ سمجھتا ہے۔ وہ موت سے گزرنے کو ایک آزاد اور وسیع فضا میں پہنچنا سمجھتا ہے اس لئے موت سے پریشان نہیں ہوتا۔ بقول اقبالؒ۔

نشانی مرد مومن با تو گویم
چوں مرگ آید تبسم بر لب اوست

یعنی میں مومن کی ایک نشانی تجھے بتا رہا ہوں کہ جب اسے موت آتی ہے تو اس کے لبوں پر مسکراہٹ کھیل رہی ہوتی ہے۔

اس لئے خدا پر ایمان اور خدا کا ذکر انسان کو سکون بخشتا ہے۔ خدا نے فرمایا۔

الا بذکر اللہ تطمئن القلوب

"اللہ کی یاد دلوں کو سکون بخشتی ہے"۔

آیات قرآنی

سورہ انعام (آیات ۹۵ تا ۹۷)

"حقیقت یہ ہے کہ اللہ ہی دانے اور گھٹلی کو پھاڑنے والا ہے۔ وہی زندگی مردہ سے نکالتا ہے۔ (یعنی بے جان مادہ سے زندہ مخلوقات کو پیدا کرتا ہے) اور مردہ کو زندہ سے نکالنے والا ہے۔ (یعنی جاندار جسموں سے بے جان مادوں کو نکالنے والا ہے) پھر تم کدھر بھٹکتے پھرتے ہو؟ (۹۵) رات کے پردے پھاڑ کر وہی صبح کو نکالنے والا ہے۔ اس نے رات کو آرام وسکون کا وقت بنایا ہے۔ اس نے چاند اور سورج کو (وقت کے) حساب کا ذریعہ بنایا ہے۔ یہ سب اسی زبردست قدرت اور علم رکھنے والے کے ٹھہرائے ہوئے انداز سے مقرر کیا ہوا نظام ہے۔ (۹۶) وہی ہے جس نے تمہارے لئے ستاروں کو مقرر کیا ہے تاکہ تم ان سے صحرا اور سمندر کے اندھیروں میں صحیح راستہ معلوم کرسکو۔ غرض ہم نے علم رکھنے والوں کے لئے اپنی باتیں کھول کھول کر بیان کردی ہیں۔ (۹۷) (سورہ انعام نمبر ۶ آیات ۹۵ تا ۹۷)

معلوم ہوا کہ جو خدائی دلیلوں، نشانیوں اور علامتوں سے جاہل نہیں، صرف وہی علم رکھنے والے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اصل میں جاہل تو وہ ہوتے ہیں جو صرف وقتی توانائی مصلحتوں اور حکومت کے دباؤ میں آکر ہر فیصلہ اور ہر عمل اختیار کرتے ہیں۔ اس آیت سے علم و آگہی کی اہمیت کا پوری طرح اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

آیت کا مختصر مفہوم یہ ہے کہ خدا کی تخلیقات کو دیکھ کر اور زندگی کے مختلف مدارج کے طویل سفر میں انسان خدا کی بے شمار دلیلیں اور نشانیاں دیکھتا ہے۔ جن سے اگر چاہے تو خدا کو پہچان سکتا ہے۔ مگر یہ پہچان صرف انہیں لوگوں کو حاصل ہو سکتی ہے جو سمجھ بوجھ سے کام لیں۔ ان کو حاصل نہیں ہو سکتی جو جانوروں کی طرح صرف اپنی حیوانی اور مادی خواہشات پوری کرنے میں اپنی ساری کی ساری توانائی خرچ کر ڈالیں۔ ایسے لوگ خدا کی دلیلوں اور نشانیوں پر غور ہی نہیں کرتے۔ انہیں اس اہم ترین کام کی ضرورت ہی نہیں ہوتی کیونکہ ان کو اس کام میں کوئی فوری مالی منفعت ہی نہیں دکھائی دیتی۔

عالم نباتات

اس وقت تقریباً چودہ لاکھ نباتات دریافت ہو چکے ہیں جن میں سے ہم اب تک صرف تین چار سو کے استعمال سے واقف ہیں۔ اسی طرح

جمادات اور حیوانات کی ان گنت تعداد ہمارے لئے اب تک راز ہے۔

امریکہ کی ایک یونیورسٹی جو علم نباتات کی تعلیم دیتی ہے اس کے دروازے پر لکھا ہے۔

"Open My Eyes so That I can Behold Wonder of God's Creation"

"اے اللہ! میری آنکھیں کھول تاکہ میں تیری تخلیق کی عجائبات کا اندازہ تو کرسکوں۔"

حضرت امام رضا علیہ السلام سے روایت ہے کہ جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ "عبادت یہ نہیں ہے کہ کثرت سے نمازوں میں کھڑا رہا جائے اور سجدوں پر سجدے کئے جائیں بلکہ عبادت یہ ہے کہ اللہ کے کاموں اور تخلیقات پر غور و فکر کیا جائے"۔(الکافی)

خدا کس طرح موت سے زندگی کو نکالتا ہے؟ اس کی جدید تفسیر یہ ہے کہ جدید علم کے ماہرین کے نزدیک تمام حیوانات اور نباتات خلیوں سے بنے ہیں۔ ان میں سے کچھ ایک خلیہ والے ہیں اور کچھ بہت سے خلیوں سے بنے ہیں۔ یہ خلئے سمندر کی ایک جھلی والے مادے "نخرمایہ" سے تیار ہوتے ہیں جو سمندروں کے ساحلوں پر ملتا ہے۔ یہ نخرمایہ سب سے پہلے ایسا تھا جو ایک خلیہ والا جانور ہے جو صرف کیچڑ میں ملتا ہے۔ اس کے بعد دو تین چار پھر ہزاروں کروڑوں خلیوں والے جانور وجود میں آئے۔ خدا نے فرمایا۔

"اللہ نے تمہیں ایک خلیہ جانور سے پیدا کیا اور اسی سے اس کی مادہ نکالی"۔(نساء)

"امیبا کے اجزائے تخلیق کاربن نائٹروجن' آکسیجن اور ہائیڈروجن ہیں۔ اسی امیبا نے ترقی کی تو مختلف جانور اور پھر انسان بنے۔ اس سے ثابت ہوا کہ حیوانی زندگی کی ابتدا سمندر سے ہوئی تھی۔

توریت میں ہے۔ "پھر ہم نے پانیوں کو حکم دیا کہ جاندار اور متحرک مخلوق پیدا کرو۔"

قرآن میں ہے۔ "شروع میں زمین اور تمام آسمان بند تھے۔ پھر ہم نے ان کو الگ الگ کر کے جاندار چیزوں کو پانی (سمندر) سے پیدا کیا۔"(القرآن)

ان خلیوں سے پہلے نباتات بنے جن میں حرکت' معدہ اور کچھ حیوانی اعضاء موجود تھے لیکن وہ دیکھنے اور سننے سے محروم تھے۔ پھر رینگنے والے کیڑے نمودار ہوئے۔ پھر اصداف اور جونکیں پیدا ہوئیں۔ پھر سلطان البحرینا' پھر مچھلیاں' مگرمچھ اور دوسرے آبی جانور بنے۔ جب زندگی نے خشکی پر قدم رکھا تو کیڑے مکوڑے اور پرندے وجود میں آئے۔ پھر انسان آیا۔ بقول اقبال"۔

عروج آدم خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارہ مہ کامل نہ بن جائے

آج بھی رحم مادر میں بالکل وہی اجزاء اور عناصر موجود ہوتے ہیں جو سمندر میں ملتے ہیں۔ اسکا درجہ حرارت بھی وہی ہے۔ رحم مادر میں پہلے ایک خلیہ سا ہوتا ہے۔ پھر چند منزلوں سے گزر کر جونک بنتا ہے۔ پھر مینڈک کی شکل اختیار کرتا ہے۔ پھر پرندوں کی سی ایک چونچ بھی (ایک چھوٹی سی) نکلتی ہے پھر چوپائے کی سی شکل کا ہوجاتا ہے۔ چوتھے مہینے نر اور مادہ کی تمیز ہوجاتی ہے۔ آٹھویں مہینے آنکھیں نکلتی ہیں' سر پر بال اگتے ہیں۔ گویا بچہ ان تمام منزلوں سے گزرتا ہے جو زندگی کے آغاز سے آج تک انسان پر گزرا ہے۔ قرآن نے انسان کے تخلیقی مادہ کو "سلالتہ" فرمایا جس کے معنی نچوڑ (Essence) کے ہوتے ہیں یعنی ایبا کا نچوڑ ہوتا ہے۔ علقہ کے معنی جونک کے ہوتے ہیں۔ مضغہ کے معنی گھوڑے کے بازو ہیں آخر میں انسانی شکل بنتی ہے۔ خدا نے فرمایا۔

"ہم نے انسان کو کیچڑ کے بچے کچے مادہ (ایبا) سے پیدا کیا اور اب اس کی تولید کا سلسلہ رحم مادر سے جاری کردیا۔ پہلے ہم نطفہ کو جونک (علقہ) کی شکل میں تبدیل کرتے ہیں' پھر اس جونک کو گوشت کا لوتھڑا گھوڑے کے بازو سے مشابہ بناتے ہیں۔ پھر ہڈیاں پیدا کرکے اس کے اوپر گوشت چڑھاتے ہیں۔ پھر اس کو انسان کی صورت دے کرباہر نکال لاتے ہیں۔ وہ بہترین خالق کس قدر قابل

تعریف ہے"۔(مومنون ۱۲۔۱۴)

دیکھئے کس طرح موت میں سے زندگی پیدا ہو رہی ہے۔ اگر آج بھی آپ پانی کو خوردبین سے دیکھیں تو اس میں چھوٹے چھوٹے بے جان ذرات دکھائی دیں گے جو خاکی ذروں سے بھی بہت چھوٹے ہیں لیکن وہ کئی ہزار جواہر سے مل کر بنتے ہیں۔ پھر ہر جوہر منفی اور مثبت اجزاء کا مرکب ہوتا ہے۔ ذرے سے بھی ہزار گنا چھوٹے ذرات سے ساری کائنات کی تعمیر ہوئی ہے۔ گویا ذرات وہ اینٹیں ہیں جن سے کائنات کی عمارت بنی ہے۔

سائنس کا یہ انکشاف خدا کے وجود اور اس کے ایک ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ اگر آج انسان زمین کے اندر میلوں گھس کر ایک دھات کا ٹکرا لے آئے اور پھر سمندروں کے اندر میلوں ڈوب کر کوئی خول اٹھالائے، پھر مریخ سے بھی کھربوں میل دور جاکر کسی ستارے کا ایک کنکر اٹھا لائے اور پھر تینوں کو خوردبین کے نیچے رکھ کر ان کا معائنہ کرے تو اسے معلوم ہوجائے گا کہ ان تینوں کے اجزائے تخلیق و ترکیب وہی ذرات برقیہ ہیں جو زمین کی سطح، ورق گل اور ہر ستارے میں پھیلے ہوئے ہیں۔ بقول اقبالؒ۔

حقیقت ایک ہے ہر شے کی خاکی ہو کہ نوری ہو
لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرے کا دل چیریں

آسمانوں سے زمین تک عناصر تکوینی کا ایک ہونا، ایک خالق کے وجود

کا ناقابل تردید اعلان ہے۔ انسان کی یہ تلاش اور محنت شاید کسی دن اس کے گستاخ ہاتھ کو دامن قدس تک بھی پہنچا سکتی ہے۔

عشق بھی ہو حجاب میں، حسن بھی ہو حجاب میں
یا تو خود آشکار ہو یا مجھے آشکار کر

ایک مغربی سائنس داں لکھتا ہے۔ "حیرت ہے کہ ایک طرف تو انسانی عقل قدرت کی بڑی بڑی عظیم الشان ایجادات کو دیکھ کر لرز اٹھتی ہے اور دوسری طرف باریک ترین ذرات کا اعجاز دیکھکر انسان کھو جاتا ہے"۔ خدا فرماتا ہے۔

"زمین و آسمان کا کوئی ذرہ (یعنی جوہر) سے بھی چھوٹا (منفیہ) یا بڑا (سالمہ) اللہ کی نگاہ سے غائب نہیں بلکہ اس کی روشن کتاب میں موجود ہے"۔ (یونس ۶۱)

قرآن میں ذرات کا ذکر فرمانا قرآن کے کلام الٰہی ہونے کی واضح دلیل ہے۔ انہیں ذرات کا مطالعہ کرنے کے بعد لارڈ کلون پکار اٹھا۔

"It is possible to concieve either the begning of the continuance of life without an over ruling creative power. Over powering strong proof of benevolent and intelligent design are to be found around us, teaching that all living things depend on One Ever lasting creator and ruler"

یعنی یہ خیال سراسر غلط ہے کہ کائنات کا آغاز یا تسلسل بغیر کسی ایک

خالق کے ہوسکتا ہے۔ فطرت کے یہ حیرت انگیز مناظر جن سے تکمیل اور رحمت برستی ہے خدا کی تخلیق اور تعمیر پر ناقابل انکار' حیران کن دلائل ہیں جو ہمیں صاف صاف بتا رہے ہیں کہ کائنات کے وجود کا انحصار ایک زندہ' ہر چیز کے قائم رکھنے والے بادشاہ کی مرضی پر ہے۔ خدا فرماتا ہے۔

"خدا زمین میں آسمانوں کی باگیں پکڑے ہوئے ہے کہ وہ کہیں اپنے مدار کو چھوڑ کر بھاگ نہ جائیں۔ اور اگر ایسا ہو جائے تو اس کے بعد کوئی نہیں جو انہیں تھام سکے۔" (فاطر)

"اللہ ہی نے آسمانوں کو تھام رکھا ہے کہ وہ زمین پر گر نہ پڑیں۔" (قرآن)

آج تک یہ بھی معلوم نہ ہوسکا کہ ان ذرات میں بجلی کہاں سے آئی؟

عجیب بات یہ ہے کہ تمام عناصر ترکیبی ہائیڈروجن' آکسیجن' الورونیم' یورونیم' سوڈیم وغیرہ جن کی تعداد اب سو سے بھی زیادہ معلوم ہو چکی ہے' یہ سارے اجزاء ایثر میں رہتے ہیں اور جس طرح ہمارے بولنے سے سانس لینے سے ہوا میں کوئی کمی نہیں ہوتی اسی طرح کائنات کی تخلیق سے ان عناصر کے خزانے ایثر میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔ جس طرح حروف سے علوم وفنون بنے ہیں اس طرح انہیں عناصر سے پوری کائنات کی تخلیق

ہوئی اور پھر بھی اس میں کوئی کمی نہیں آئی۔ خدا نے فرمایا۔

"اگر خدا کی باتوں کو لکھنے کے لئے تمام سمندر سیاہی بن جائیں اور ان میں سات سمندر اور ملا لئے جائیں، تب بھی خدا کی تخلیق اور عظمت کی مکمل فہرست تیار نہ ہو سکے گی"۔(کہف ۱۰۹)

(دو قرآن)

حیات بعد الموت

علامہ اقبالؒ نے موت کے بعد زندہ ہونے اور ترقی کرنے کے عجیب وغریب دلائل دیئے ہیں۔

(۱) جب ہر شام کے بعد صبح آتی ہے تو کیا شام موت کی کوئی صبح نہیں ہوگی؟

(۲) جب دانا زمین میں گرتا ہے تو درخت بن جاتا ہے تو کیا انسان زمین میں دفن ہو کر کچھ بھی نہ بنے گا؟

(۳) پرندہ اڑنے سے پہلے پر سمیٹتا ہے، موت بھی پروں کا سمیٹنا ہے تو موت کے بعد پرواز نہ ہوگی؟

(۴) غنچے کی موت پھول کے لئے پیام زندگی ہے اور پیام شگفتگی ہے تو کیا انسان کی موت اس کی روح کے لئے پیام بالیدگی نہیں بنے گی؟

(۵) ساحل سمندر پر مشرق کی طرف سے ایک جہاز آتا ہے اور سمندر کی

طرف وسعتوں میں غائب ہوجاتا ہے بس یہی حال انسان کا ہے۔ موت اسے آنکھوں سے تو چھپادیتی ہے لیکن مٹا نہیں سکتی؟

(۶) ایک تصویر بنانے والے کی پوری کوشش یہ ہوتی ہے کہ اس کی بنائی ہوئی تصویر پائیدار ہو۔ کیا انسان کا خالق یہ نہ چاہے گا کہ اس کی تخلیق پائیدار ہو؟

(۷) جب بارش برستی ہے تو زمین کی قوتیں بیدار ہوجاتی ہیں۔ موت بھی ایک طرح کی بارش ہے جس سے زندگی زیادہ حسین اور زیادہ دلکش بن جاتی ہے۔

(۸) موت اسرار حیات کو بے حجاب کرتی ہے۔

(۹) موت ایک نئی دنیا میں لے جاتی ہے اور ہر نئی چیز لذیذ ہوتی ہے۔

(۱۰) موت دنیا کے مصائب کا خاتمہ کردیتی ہے۔

(۱۱) موت ایک سواری ہے جو ہمیں خدا اور اس کے خاص بندوں کے جوار میں پہنچادیتی ہے؟

خدا فرماتا ہے۔

"حقیقتاً موت جس سے تم بھاگتے ہو، وہ ضرور تم سے مل کر رہے گی۔ پھر تم اس کی طرف لوٹادیئے جاؤگے جو ہر ظاہری اور چھپی ہوئی باتوں کو جاننے والا ہے۔ پھر وہ تمہیں سب کچھ بتائے گا جو تم کیا کرتے تھے"۔(سورہ جمعہ)

"موت کے بعد انسان اپنے سچے اور حقیقی مالک کی طرف لوٹا دیا جائے گا۔ یاد رکھو کہ وہی کائنات کا حاکم ہے اور بہت جلد حساب لینے والا ہے"۔(سورہ انعام)

دنیا کا عظیم ماہر ریاضیات لکھتا ہے۔

جدید سائنس اس بات کا ثبوت فراہم کرتی ہے کہ مادے کے رنگا رنگ مظاہر میں ایک معنوی ترتیب اور ایک بامقصد ربط موجود ہے۔ یہی چیز کولمبس کے اصول کشش کے تصور سے مقابلہ کر کے دیکھا تو مجھے حیرت ہوئی کہ ان میں کس قدر مشابہت پائی جاتی ہے۔ ایک دو ہم جنس چارج پروٹون مزاحمت کرتے ہیں تو دوسری طرف اجسام کے درمیان کشش پیدا ہوتی ہے۔ پھر عجیب بات یہ ہے کہ ان اختلافات میں ایک عظیم مقصدیت پائی جاتی ہے۔

اسی طرح تحفظ مساوات کا اصول بھی مقصد میں ہم آہنگی کا اظہار کرتا ہے۔ اس اصول کے مطابق تابندہ مرکز سے جو الیکٹرون باہر نکلتے ہیں وہ بڑی زبردست یکسانیت کے ساتھ ایک خاص زاویے سے برآمد ہوتے ہیں۔ عجیب ترین بات یہ ہے کہ وہ مرکز کے گھومنے میں اسی سمت سے خارج ہوتے ہیں جو سمت قابل ترجیح ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہمیں یہ بھی دکھائی دیتا ہے کہ اس میں مسلسل نظام کی خلاف ورزیاں ہوتی ہیں کیونکہ پروٹون مساوات کی پابندی نہیں کرتا۔ ایسا معلوم

ہوتا ہے کہ نیوٹرون دائیں اور بائیں سمت میں امتیاز کر سکتا ہے اور ان ذرات کو یہ خبر پہنچادیتا ہے جن کے ساتھ اسکا قریبی کاموں میں کچھ تعلق ہوتا ہے۔ اس جیسی بے شمار مثالیں ثابت کرتی ہیں کہ اس کائنات کی کوئی ابتدا ہے' کوئی خالق ہے اور اسکا انتظام بہت سے بر سرپیکار خداؤں کے ہاتھ میں نہیں ہے بلکہ خدائے واحد کے دست قدرت میں ہے۔

ریاضی دان اور سائنس دان مادی جسم کی ساخت میں بھی انتہائی کمال کا مظاہرہ دیکھتے ہیں۔مثلاً انسانی جسم کے خون کے ذرات انتہائی مناسب شکل اور قد و قامت کے مالک ہوتے ہیں جو ان کے فرائض منصبی کے عین مطابق ہوتی ہے۔ یہی اصول تمام تر اعضاء اور ذرات پر صادق آتا ہے۔(ماخوذ از مقالہ ڈاکٹر ارل چسٹر ایکس عظیم ماہر ریاضیات وطبیعات)

ضد سے ضد کا وجود

کائنات میں ہم دیکھ رہے ہیں کہ ضد سے ضد کا وجود ہوتا ہے۔ موت سے زندگی پیدا ہوتی ہے۔ رات سے دن اور دن سے رات نکلتی ہے۔ سرسبز و شاداب درخت سے چنگاریاں جھڑتی ہیں۔ علت و معلول کے تمام قوانین سے یہ بات بالاتر ہے۔ یہاں آکر ہمارا قانون پیدائش بالکل ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے۔ اس لئے ماننا پڑتا ہے کہ کوئی ہستی ان ضوابط سے بالاتر ہے جو ان سب پر قدرت کاملہ اور تصرف رکھتی ہے اور وہ ذات اضداد

سے اضداد کو وجود میں لاتی ہے۔ پھر ان چیزوں کو اپنی مخلوقات کے لئے نافع بھی بناتی ہے۔ جو لوگ کائنات کو محض علت و معلول کے اندھے اور بہرے قوانین و قواعد کا نتیجہ سمجھتے ہیں' وہ موت سے زندگی اور زندگی سے موت کے پیدا ہونے کی کیا وجہ بتا سکتے ہیں؟ کیا علت و معلول کے عام قاعدے اور ضابطے کا تقاضا یہی ہو سکتا ہے؟ اگر ایسا نہیں تو مانئے کہ کوئی ذات ہے جو ان تمام طبعی قوانین پر حاکم و متصرف ہے۔

شرک کی نفی

کائنات کے مختلف اجزاء کا باہمی توافق اور ربط

(Co-Relation)

خدا کے وجود اور توحید کی حقیقت کو سمجھنے کے لئے کائنات کے مختلف اجزاء میں توافق (Harmoney) اور ان کی باہمی کارسازگاری بہت اہم ہے جبکہ دنیا کے مختلف اجزاء ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ مثلاً ایک عورت ایک مرد سے بالکل مختلف خصوصیات و صفات رکھتی ہے۔ مگر اس کے باوجود عورت کے پاس جو کچھ ہے وہ مرد کو نہ صرف مطلوب و مرغوب ہے بلکہ اگر عورت نہ ہو تو مرد کا وجود اور اسکی قوتوں اور صلاحیتوں کا بڑا حصہ بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس طرح مرد کے پاس جو کچھ ہے وہ عورت کے تقاضوں کا بھرپور جواب ہے۔ ٹھیک یہی حال کائنات کے تمام

اجزاء کا ہے۔ جس طرح عورت یا مرد تنہا بے مقصد ہو کر رہ جاتے ہیں اسی طرح کائنات کی ہر چیز اپنے جوڑے کے بغیر بے مقصد ہو کر رہ جاتی ہے۔ کوئی چیز اپنے مقصد کو پورا ہی اس وقت کرتی ہے جب اپنے جوڑے سے ملتی ہے۔ جیسے زمین آسمان' دن رات' سردی گرمی' روشنی اندھیرا' ایک دوسرے کی ضد ہوتے ہوئے ایک دوسرے کے لئے ضروری ہیں۔

نیز یہ کہ دنیا کی ہر چیز اپنی بقا اور نشوونما کے لئے اسی بات کی محتاج ہے کہ پوری کائنات اس کے لئے کام کرے۔ گیہوں کا ایک پودا اس وقت تک وجود میں آکر کمال کو نہیں پہنچ سکتا جب تک کائنات کے تمام عناصر اس کی پرورش میں اپنا اپنا حصہ ادا نہ کریں۔ زمین اس کے لئے گہوارہ بنے۔ پانی غذا بنے۔ سورج حرارت فراہم کرے اور اسے گرم رکھے۔ شبنم اسے ٹھنڈک پہنچائے۔ ہوائیں اسے لہلہائیں اور لوریاں سنائیں۔ ستارے ان پر اپنی چمک دمک برسائیں۔ غرض پوری کائنات جب حرکت میں آئے تو ایک لقمہ ہمارے لئے فراہم ہو۔

اب سوال یہ ہے کہ پوری کائنات میں یہ توافق' یہ ہم آہنگی' یہ ارتباط' یہ سازگاری اتفاقاً" پیدا ہو سکتی ہے؟ کیا ساری کائنات کے مختلف النوع اجزاء از خود پیدا بھی ہوئے اور ان میں اتنا حیرت انگیز توافق (Harmoney) از خود اتفاقاً" پیدا ہو گیا؟ پھر یہ سارے کے سارے اجزا اتفاقاً" انسان کے لئے سازگار بن کر اس کے خدمت گار بن گئے؟

کیا انسان کی عقل اس قسم کے حیرت انگیز مسلسل کام کرنے والے اتفاقات کو تسلیم کر سکتی ہے۔" خدا فرماتا ہے۔

"اور ہر چیز سے ہم نے جوڑے پیدا کئے تاکہ تم سوچو اور سمجھو بس اللہ کی طرف بھاگو"۔(الذاریات۵۱)

کیونکہ کائنات کی بقاء اضداد کے توافق اور سازگاری پر مبنی ہے اس لئے ماننا پڑے گا کہ کوئی خالق حکیم وقوی ان مختلف اجزاء میں ربط واتصال پیدا کر کے ان سے صالح نتائج پیدا کر رہا ہے۔ کائنات کی مختلف چیزیں ہرگز یہ نہیں بتاتیں کہ یہاں مختلف ارادے کام کر رہے ہیں بلکہ ان مختلف عناصر کا باہمی توافق اور ارتباط یہ بتاتا ہے کہ صرف ایک ہی ہے جس کے تصرف کے تحت اس کائنات کے تمام اجزاء اپنے مقصد کو پورا کر رہے ہیں جیسا کہ خدا نے فرمایا۔

"اور اللہ ہی نے آسمان سے پانی اتارا۔ پھر اس سے زمین کو زندہ کیا' وہ بھی اس کے سوکھنے کے بعد۔ بے شک اس بات میں ان لوگوں کے لئے (ہماری قدرت اور حکمت کی) بڑی دلیل ہے جو بات کو سنتے ہیں۔ بیشک تمہارے لئے چوپاؤں میں بھی بڑا سبق ہے۔ (دیکھو) ہم ان کے پیٹوں کے اندر گوبر اور خون کے درمیان تم کو

خالص دودھ پلاتے ہیں جو پینے والوں کے لئے نہایت خوشگوار' مزیدار ہوتا ہے اور کھجوروں اور انگوروں کے پھلوں سے بھی۔ تم ان سے نشے کی چیزیں بھی بناتے ہو اور کھانے کی چیزیں بھی۔ بے شک اس میں بڑی نشانی ہے ان لوگوں کے لئے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔

(مثلاً) تمہارے پالنے والے مالک نے شہد کی مکھی کو خفیہ اشارہ کیا کہ درختوں اور چھتوں پر چھتے بنا۔ پھر ہر قسم کے پھلوں سے رس چوس۔ پھر اپنے مالک کے ہموار راستوں پر چل۔ اس کے پیٹ سے مشروب نکلتا ہے جس کے رنگ الگ الگ ہوتے ہیں۔ اس میں لوگوں کے لئے شفا بھی ہے اور اس کے اندر بڑی دلیل ہے ان لوگوں کے لئے جو غور و فکر کرتے ہیں"۔ (نحل ۶۱-۶۵ سے ۶۹)

اس عالمگیر ہم آہنگی کو دیکھئے۔ (۱) بادلوں کا برسنا (۲) زمین کا لہلہانا (۳) اس سے چوپائیوں کا چرنا۔ (۴) دودھ بننا۔ (۵) دودھ کا لذیذ و مفید ہونا۔ قوت بخش ہونا۔ (۶) انگور اور کھجور کا لذت بخش ہونا۔ (۷) شہد کا لذت بخش اور انسان کے لئے مفید ہونا۔ یہ سب باتیں بتاتی ہیں کہ کوئی ایک علیم و حکیم ہے جو یہ سارا نظام کسی مقصد کے تحت چلا رہا ہے کیونکہ اس قدر دور دراز کی چیزوں میں اتنے گہرے رشتے کیسے پیدا ہو گئے؟ متضاد

چیزوں کے کشاکشوں میں توافق اور سازگاری کے اتنے کچھ پہلو کیسے نکل آئے؟ ان اضداد کو دیکھو اور ان میں سے صالح نتائج کا نکلنا دیکھو۔ یہ سب گواہی دے رہے ہیں کہ ایک علیم و حکیم ہاتھ اس کائنات پر متصرف ہے۔ خدا فرماتا ہے۔

"دونوں دریا یکساں نہیں۔ ایک میٹھا ہے جو پیاس بجھانے والا ہے، خوشگوار ہے۔ دوسرا کھاری کڑوا ہے۔ مگر تم ان دونوں سے تازہ گوشت بھی کھاتے ہو اور زینت کی چیزیں بھی نکال کر پہنتے ہو۔ پھر تم یہ بھی دیکھتے ہو کہ کشتیاں کس طرح ان پانیوں کو پھاڑتی چیرتی چلی جاتی ہیں تاکہ تم خدا کے فضل و کرم کو (یعنی روزی) کو تلاش کرسکو اور تاکہ پھر تم خدا کے شکر گزار بن سکو۔

وہی خدا رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور اس نے سورج اور چاند کو قابو میں کر رکھا ہے۔ (اسی لئے) ہر ایک معین وقت میں گردش کرتا ہے۔ وہی اللہ تمہارے پالنے والا مالک ہے۔ اسی کی بادشاہی ہے۔(فاطر ۳۵۔ ۱۲ سے ۱۳)

دیکھئے کس طرح متضاد چیزیں مشترک مقصد کے حصول کا ذریعہ بن رہی ہیں۔ کس طرح انسان ان تمام چیزوں سے روزی کما رہا ہے اور آرام بھی

پا رہا ہے۔ کائنات کی ہر چیز بالواسطہ انسان کی خدمت کر رہی ہے۔ اس کے باوجود یہ کہنا کہ دنیا اتفاقات کا نتیجہ ہے، علم و تحقیق عقل و فکر کا مذاق اڑانے کے مترادف ہے۔

آیت الکرسی (سورہ بقرہ ۲۵۵ سے ۲۵۷)

"(۱) اللہ وہ زندہ پائندہ ہے کہ جس کے سوا کوئی خدا نہیں۔ (۲) جو پوری کائنات کا سنبھالنے والا ہے۔ (۳) نہ تو وہ سوتا ہے اور نہ اسے اونگھ آتی ہے۔ (۴) زمین و آسمانوں میں جو کچھ بھی ہے سب اسی کا ہے۔ (۵) ایسا کون ہے جو اس کے سامنے اس کی اجازت کے بغیر کوئی سفارش کرسکے؟ (۶) جو کچھ ان کے سامنے ہے وہ اسے بھی جانتا ہے اور جو کچھ ان سے چھپا ہوا ہے' اس سے بھی وہ واقف ہے۔ (۷) اس کے علم میں سے کسی چیز کا بھی لوگ احاطہ نہیں کرسکتے۔ (یعنی اس کا علم لامحدود اور ناقابل فہم ہے) سوا اس کے کہ وہ خود اس میں کسی چیز کا علم ان کو دیدے۔ (۸) اس کی کرسی (یعنی علم و حکومت) سب آسانوں اور زمین پر پھیلی ہوئی ہے۔ اور ان سب کی حفاظت اس کے لئے (کوئی مشکل) یا تھکا دینے والا کام نہیں۔ (کیونکہ) وہ ذات بہت بڑی' بلند مرتبہ اور عظیم الشان ہے۔(۲۵۵)

دین میں کوئی زبردستی نہیں ہے۔ (دین تو یہ ہے کہ) ہدایت کی

بات کو گمراہی سے بالکل الگ کر کے ظاہر کردیا گیا ہے۔ اب جو کوئی بھی طاغوت (یعنی ظالم سرکش بے دین حاکم یا شیطان) کا انکار کر کے اللہ کو دل سے مان لے' تو اس نے وہ مضبوط رسی پکڑلی جو کبھی ٹوٹ ہی نہیں سکتی۔ (کیونکہ) اللہ سب کچھ سننے والا اور ہر چیز کو پوری پوری طرح جاننے والا ہے"۔(۲۵۶)

تشریح

جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ "ایک دفعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پوچھا کہ کیا خدا سوتا بھی ہے؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہی سوال خدا سے پوچھا۔ خدا نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ دو بوتلیں ہاتھ میں لئے رہو اور ہرگز نہ سونا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ہرچند ضبط کیا لیکن نیند غالب آگئی اور بوتلیں گر کر ٹوٹ گئیں۔ خدا نے فرمایا۔ "موسیٰ تم نیند کے عالم میں دو بوتلوں کی حفاظت نہ کرسکے۔ اگر میں سوجاؤں تو ساری دنیا کی حفاظت کون کرے گا؟ (مجمع البیان)

کرسی سے مراد خدا کا اقتدار بھی ہے اور علم بھی۔ (بیان اللسان ص ۶۴۵)

خدا کے زندہ ہونے کے معنی جسم رکھنے کے نہیں بلکہ زندگی کے

تقاضے پورے ہونے کے ہیں اور قیوم قائم کا مبالغہ ہے اور اس کے معنی زندہ اور برقرار رہنے کے ہیں۔ (تفسیر معانی۔ شاہ رفیع الدین تاج العلماء)

قیوم کے دوسرے معنی کائنات کا نظام برقرار رکھنے والا بھی ہیں۔ (شاہ ولی اللہ۔ جلالین۔ تفسیر صافی۔ تفسیر مجمع البیان)

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا کہ "یہودیوں کا خیال تھا کہ خدا زمین و آسمان پیدا کرنے کے بعد تھک کر کرسی پر ٹیک لگا کر ایک خاص انداز سے بیٹھ گیا اور آرام کرنے لگا۔ خدا نے اس تصور کو رد کر دیا۔"

اس آیت سے شفاعت کا مفہوم ثابت ہوگیا ہے کیونکہ شفاعت کی نفی کر کے اس میں استثناء کیا گیا ہے یعنی وہی لوگ شفاعت کر سکیں گے جن کو خدا نے لوگوں کے حالات کا پورا پورا علم دیا ہوگا۔ اس لئے محققین نے اس آیت سے انبیاء اور اولیاء علیہم السلام کے علم غیب کو بھی ثابت کیا ہے۔ (مجمع البیان)

اسمائے الٰہی

آیت الکرسی ہی میں خدا کے چند اہم اسماء ہیں۔ (ا) حیّ۔ یعنی زندہ۔ مطلب یہ ہے کہ خدا ہمیشہ سے زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گا۔ وہ ازلی و ابدی ہے۔ صفت حیات اس کی جزو ذات ہے۔ یعنی زندگی کے تمام

لوازمات اس میں بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں۔ (۲) قیوم۔ یعنی جو خود اپنی ذات سے قائم ودائم ہے اور دوسروں کے قائم رہنے کا سبب بھی ہے۔ سب کو سنبھالے ہوئے ہے۔ اس لئے سب اس کے محتاج ہیں اور وہ کسی کا محتاج نہیں۔ (راغب۔ تاج العلماء۔ ابن کثیر)

(۳) علی۔ یعنی بلند۔ جو تمام نقائص سے بلند وپاک ہو۔ شریک سے بلند، چیزوں کے مانند ہونے سے بلند۔ جس کی ذات ذہن میں آنے سے بلند۔ جس کا علم اور قدرت حدوں سے بلند ہے۔ (۴) عظیم۔ یعنی جس کے بلند مرتبے کی کوئی حد نہ ہو اور اس تک کوئی نہ پہنچ سکے۔ (روح۔ بحر)

طاغوت سے مراد سرکش شیطان اور حاکم جابر وظالم ہے۔ اولیں معنی میں وہ لوگ طاغوت ہیں جنہوں نے محمد وآل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ظلم کیا اور ان کا حق غصب کیا اور ان کے مقابلے پر اپنی امامت کا دعویٰ کیا۔ (تفسیر صافی ص ۱۷)

عروۃ الوثقیٰ۔ یعنی مضبوط رسی سے اولین مراد خدا کا دین اور محمد وآل محمد علیہم السلام کی محبت ہے۔ جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ "جو کوئی یہ چاہے کہ وہ ایسی رسی یا حلقے کو پکڑے جو کبھی نہ ٹوٹے تو اسے چاہئے کہ میرے بھائی اور میرے وصی علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی ولایت (یعنی) سرپرستی محبت واطاعت کرے کیونکہ جو کوئی ایسا کرے گا خدا اسے برباد نہیں ہونے دے گا اور جو علی سے دشمنی رکھے

گا اسے نجات نہ دے گا۔" (تفسیر صافی ص ۱۷)

آیت کا پیغام یہ ہے خدا کسی کو زبردستی مسلمان بنانے کو پسند نہیں کرتا۔ (فصل الخطاب)

آخر میں خدا کو علیم یعنی ہر چیز کا جاننے والا فرمانا بتاتا ہے کہ خدا کا علم انسان کے تمام ارادوں اور اعمال پر پوری پوری طرح حاوی ہے۔ خدا نے شفاعت کی اجازت اس لئے نہیں دی کہ معاذاللہ اس کا علم ناقص ہے بلکہ شفاعت کی اجازت خدا کے فضل و کرم کا اظہار ہے۔ اس کی رحمت کا اعلان ہے اور صاحبان شفاعت کی عظمت کا اظہار ہے۔ ورنہ خدا خود ہمارے اعمال کی حقیقت کو مکمل طور پر جانتا ہے۔ (ابن جریر از ابن عباسؓ کشاف، قاموس، راغب تفسیر کبیر۔ معالم)

سورۂ بقرہ (آیت ۲۵۷)

"اللہ ان لوگوں کا سرپرست و حامی اور مددگار ہے جو اس کو دل سے مانتے ہیں وہ ان کو (گمراہی مایوسیوں کے اندھیروں سے (ہدایت اور امید کی) روشنی میں نکال لاتا ہے۔ مگر جو لوگ خدا سے انکار اور کفر اختیار کرتے ہیں۔ ان کا سرپرست حامی اور مددگار طاغوت ہیں۔ جو ان کو ہدایت کی روشنی سے (گمراہی' سرکشی اور ظلم کے) اندھیروں میں کھینچ کر لے جاتے ہیں۔ یہی لوگ تو جہنمی ہیں اور یہی وہ لوگ ہیں جو اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے"۔

تشریح

روشنی یا نور سے اولین مراد ہدایت ہے جس کا سرچشمہ محمد و آل محمد علیہم السلام ہیں اس لئے اندھیروں سے مراد محمد و آل محمد علیہم السلام کے دشمن یا ان سے دشمنی ہے۔ (تفسیر صافی ص ۷۱ بحوالہ الکافی بقول امام جعفر صادقؑ)

"ولی" یعنی سرپرست' حامی' مددگار اور پشت پناہ کے ہوتے ہیں۔ (بیضاوی۔ ابن جریر۔ روح)

ولی کے مصدر کے معنی ایسی نزدیکی کے ہیں جس میں کوئی فاصلہ نہ ہو۔

اور ولی وہ ہوتا ہے جو دوسروں سے اولیٰ ہو اور ان کے انتظام اور سرپرستی کا حقدار ہو۔ ولی کا لفظ واوٗ' لام' ی سے مشتق ہے اور اسی سے والی بھی بنا ہے جس کے معنی حاکم اور صاحب اختیار کے ہوتے ہیں اور اسی لفظ سے متولی بھی بنا ہے جس کے معنی انتظام کا ذمہ دار ہوتا ہے۔(مجمع البیان۔ از علامہ طبرسیؒ)

یہاں ولی کے معنی بگڑی بنانے والا اور آڑے وقت میں کام آنے والا ہے۔(راغب)

اور خدا کا فرمانا کہ وہ اندھیروں سے نکال کر ہدایت کی روشنی میں لاتا ہے تو اسی کے معنی کسی کو مجبور کرنا نہیں ہوتے بلکہ اس کے معنی نیکی کے محرکات' ہدایات اور توفیقات فراہم کرنے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ خدا مومنین کو کفر و شرک اور ظلم و ستم کے اندھیروں سے بچاتا ہے اور طاغوت نے ان کو ان برائیوں میں مبتلا کیا اور نور ہدایت حاصل کرنے سے روکا۔ جس طرح عرب کہتے ہیں "اسے اس کے باپ نے میراث سے نکال دیا" یعنی اس کو میراث نہ ملنے دی۔(مجمع البیان ۔ فصل الخطاب)

محققین نے نتیجہ نکالا کہ بندہ ہر لمحے خدا کی توفیقات اور توجہات کا محتاج ہے۔ اگر بندہ خدا کی طرف اس کی اطاعت کے ذریعہ متوجہ ہوتا ہے تو خدا اپنی توجہات سے اسے نوازتا ہے جیسا کہ خدا فرماتا ہے "تم جہنم کی آگ کے کنارے پر تھے تو خدا نے تم کو بچا لیا" ظاہر ہے اس کا مطلب یہ

نہیں کہ تم جہنم کے اندر تھے۔ اسی طرح خدا کا مومنین کو گمراہی کی تاریکی سے نکالنے کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ گمراہی کے اندھیروں کے اندر تھے۔ مطلب یہ ہے کہ خدا نے اپنے ماننے والوں اور اطاعت کرنے والوں کو اپنی نیک توفیقات کے ذریعہ ہر قسم کی گمراہی کے اندھیروں سے بچائے رکھا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کسی آدمی کو یہ کہتے سنا کہ "میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی خدا نہیں" آپ نے فرمایا "یہ فطرت کے تقاضوں پر قائم ہے" پھر اس شخص نے کہا "میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم' اللہ کے رسول ہیں" اس پر جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا "بس اب یہ آگ سے نکل آیا" ظاہر ہے کہ یہ کہتے ہوئے آگ کے اندر تو نہ تھا۔ (غرائب القرآن نیشاپوری)

عبداللہ ابن یعفور نے امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں عرض کی کہ جو لوگ آپ سے تولا نہیں کرتے۔ یعنی آپ کو اپنا امام اور حاکم نہیں سمجھتے ان میں امانت' سچائی اور وفاداری پائی جاتی ہے۔ جبکہ آپ سے تولا رکھنے والوں میں یہ اوصاف نہیں۔ یہ سنتے ہی امام سیدھے ہو بیٹھے اور فرمایا "جو شخص ظالم کی امات ولایت اور حکومت کو دل سے مانتا ہو جس کو خدا نے حاکم نہیں بنایا' اس کا کوئی دین نہیں ہے پھر آپؑ نے یہی آیت تلاوت فرمائی۔

غرض حاصل مطلب یہ ہے کہ جو امام برحق کو دل سے مانتا ہے اور ظالموں کا ساتھ نہیں دیتا خدا اس کو گناہ کی تاریکیوں سے نکال کر توبہ اور اپنی بخشش کی روشنی کی طرف لے آتا ہے۔

سورۂ بقرہ (آیت ۲۵۸)

"کیا تم نے اس شخص کی حالت کو نہیں دیکھا جو ابراہیم(علیہ السلام) سے ان کے پالنے والے مالک کے بارے میں جھگڑا؟ (صرف اس لئے کہ اس شخص کو خدا نے حکومت دی تھی)جب ابراہیمؑ نے کہا "میرا پالنے والا مالک تو وہ ہے جو زندگی اور موت پر اختیار رکھتا ہے" تو اس (نمرود) نے کہا "میں بھی زندگی اور موت پر اختیار رکھتا ہوں" (پھر اس شخص نے ایک اور واجب القتل قیدی کو تو رہا کر دیا' اور ایک بے گناہ آدمی کو قتل کر دیا) ابراہیمؑ نے کہا "اللہ تو وہ ہے جو سورج کو مشرق سے نکالتا ہے۔ تو اس کو مغرب سے نکال لا" (یہ سن کر) وہ (نمرود) منکر حق ہکا بکا رہ گیا۔ (مگر پھر

بھی ایمان نہ لایا غرض) خدا ظالموں کو ہدایت (کی توفیق) ہی نہیں دیا کرتا"۔

تشریح

محققین نے نتیجہ نکالا کہ حضرات انبیاء خدا اوراس کی توحید پر صُرف خدا کے افعال سے استدلال کرتے ہیں۔ وہ خدا کی کوئی ایسی صفت پیش نہیں کرتے جن سے تشبیہ یا تجسیم کے لئے کوئی گنجائش نکل سکے۔(جصاص)

محققین نے دوسرا نتیجہ یہ نکالا کہ وقت ضرورت دین کی حقیقتوں کو بحث و مباحثہ سے ثابت کیا جاسکتا ہے اس لئے علم کلام انبیاء کی سنت ہے۔(جصاص)

اکابر ماہرین نے اعتراف کیا ہے کہ نصف صدی پہلے بائبل کے قصوں کو جس طرح بے حقیقت' بے اصل اور غیر معتبر سمجھا جاتا تھا' اب وہ خیال تحقیق کی وجہ سے قائم نہیں رہا۔ یہاں تک کہ نمرود کے ساتھ ابراہیم کا مناظرہ بھی غیر معتبر نہیں۔(انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا جلد ۳ ۔ ص ۱۶۵۰)

کیونکہ نمرود خود کو سورج دیوتا کا اوتار کہتا تھا اور ان لوگوں کے عقیدے میں سورج ہی معبود اعظم تھا' اس لئے حضرت ابراہیمؑ کا استدلال

یہ تھا کہ تم سورج کو قادر مطلق سمجھتے ہو تو یہی سورج اپنے ارادے سے خدا کے مقرر کئے ہوئے راستے سے ذرا اپنا رخ بدل کردکھا دے۔ دوسروں پر قدرت رکھنا الگ رہا۔ خود اپنے ہی اوپر اپنا زور چلا کر دکھائے۔ وہ بھی صرف اتنا کہ اپنا رخ بدل دے۔ کسی خدا کی بے بسی کا منظر اس سے بڑھکر اور کیا ہوگا۔ نمرود جو سورج کو خدا سمجھتا تھا اور خود کو اس کا اوتار کہتا تھا اس کے عقیدے کو باطل کرنے کے لئے سورج ہی کی مثال پیش کرنا کتنا فصیح و بلیغ استدلال تھا۔(ماجدی)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا پیغام یہ ہے کہ خدا کو پہچاننے اور اس تک رسائی حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کی تخلیقات پر غور و فکر کیا جائے۔ اسی لئے پورے قرآن میں تمام فقہی مسائل پر صرف ۲۵۵ آیات ہیں۔ جبکہ کائنات پر غوروفکر کرنے کا تذکرہ ۷۵۶ مرتبہ کیا گیا ہے۔ مثلاً خدا نے فرمایا "زمین و آسمان میں مومنین کے لئے خدا کی نشانیاں' دلیلیں' حقیقتیں موجود ہیں" (جاثیہ)

"یہ لوگ زمین پر سیر کیوں نہیں کرتے تاکہ ان کے دل سمجھنے اور غور کرنے لگیں اور ان کے کان حقیقتوں کو سننے لگیں" (حج ۴۶)

"بار بار دیکھو۔ کیا تمہیں خدا کی تخلیق میں کوئی بے نظمی نظر آئی"۔(ملک ۳)

یورپ کے ایک ماہر طبیعات نے اندازہ لگایا ہے کہ تمام دنیا میں ہر سال صرف آدھا چھٹانک وزن کی بجلی خرچ ہوتی ہے۔ جس کی پیداوار پر ساٹھ کروڑ ڈالر خرچ ہوتے ہیں جبکہ سورج کی روشنی جو صرف ایک دن میں آتی ہے اس کا وزن ۴۴۸۰ من ہوتا ہے۔ اس طرح اس روشنی کی قیمت کروڑوں اربوں ڈالر سے بھی زیادہ ہوگی۔ خدا کا لطف و کرم دیکھئے کہ ہم ایک ٹکا بھی خرچ کئے بغیر روزانہ کروڑوں اربوں ڈالر کی روشنی اور توانائی سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

تمام ثوابت اور سیارے دراصل بڑے عظیم سورج ہیں جو ہم سے بہت دور ہیں اور ان کی یہ دوری بڑی رحمت ہے۔ اگر وہ ہم سے قریب ہو جائیں تو ہم ان کی حرارت سے جل کر راکھ ہو جائیں اور پھر وہ عاری زمین کو بھی اپنی طرف کھینچ لے۔ اس طرح پورا نظام شمسی درہم برہم ہو کر رہ جائے۔ اب تک سولہ کروڑ سیارے یعنی سورج دریافت ہو چکے ہیں۔ گویا اس فضائے آسمانی میں ہماری زمین سے لاکھوں گنا بڑی زمینیں گھوم رہی ہیں۔ کروڑوں سورج، چاند، ستارے ناچ رہے ہیں۔ ہر طرف حیران کر دینے والا سلسلہ موجود ہے۔ جو خدا اندھیروں میں سے ایسی ایسی روشنیاں نکال سکتا ہے اس کے لئے موت کے اندھیروں سے زندگی کو دوبارہ نکال لینا کیا مشکل ہے؟

"ان چیزوں پر غور کرنے سے خدا کی عظمت' قدرت' حکمت' رحمت' رحمانیت' رحمیت سمجھ میں آتی ہے اسی لئے خدا نے فرمایا "ہم نے آسمان اور زمین کو اور جو کچھ بھی ان کے درمیان ہے محض کھیل تماشے کے لئے پیدا نہیں کیا"۔(دخان ۳۷)

پھر فرمایا "زمین اور آسمان اللہ کی بڑائی کی داستانیں سنا رہے ہیں کہ وہ مالک غالب بلند و برتر اور صاحب حکمت ہے"۔(جاثیہ ۳۷)

"خدا رات کو دن میں اور دن کو رات میں تبدیل کرتا ہے۔ خدا کی مرضی کے سامنے تمام چاند' سورج مجبور ہیں۔ (اس لئے) یہ ایک معین مدت تک گھومتے پھرتے رہیں گے۔ یہ ہے تمہارا پالنے والا مالک جو فرمانروا ہے۔ رہے (جھوٹے خدا جن کی تم خوشامد کرتے پھرتے ہو) وہ ایک ذرے کے بھی مالک نہیں"۔(فاطر ۱۴)